کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:11 Issue: 6 June 2018

مدیر

مولانا محمد عبد القوی

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ادارہ

مومنِ کامل کی مخصوص صفات

مولانا مفتی شفیع عثمانیؒ

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝۴ (سورۃ الانفال)

ترجمہ: بس ایمان والے تو وہی ہوتے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر آتا ہے تو (اُس کی عظمت کے استحضار سے) ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن کو پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں اُن کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (اور) جو کہ نماز کی اقامت کرتے ہیں اور ہم نے اُن کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں (بس) سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں ان کے رب کے پاس اُن کے لئے بڑے بڑے درجے ہیں اور (ان کے لئے) مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔

تشریح: آیاتِ مذکورہ میں اُن مخصوص صفات کا بیان ہے جو ہر مؤمن میں ہونا چاہیئے، اس میں اشارہ ہے کہ ہر مؤمن اپنی ظاہری اور باطنی کیفیات اور صفات کا جائزہ لیتا رہے اگر یہ صفات اس میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے کہ اُس نے اِس کو مؤمنین کی صفات عطا فرما دی، اور اگر ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں ہے یا ہے مگر ضعیف و کمزور ہے تو اُس کے حاصل کرنے یا قوی کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صفت خوفِ خدا

پہلی صفت یہ بیان فرمائی اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ یعنی جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں رچی اور

بھری ہوئی ہے جس کا ایک تقاضا ہیبت وخوف ہے۔ اور دوسری آیت میں ذکر اللہ کی یہ خاصیت بھی بیان کی گئی ہے کہ اُس سے دل مطمئن ہوجاتے ہیں: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یعنی اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں؛ اس سے معلوم ہوا کہ اُس آیت میں جس خوف وہیبت کا ذکر ہے وہ دل کے سکون واطمینان کے خلاف نہیں جیسے کسی درندے یا دشمن کا خوف قلب کے سکون کو برباد کردیتا ہے، ذکر اللہ کے ساتھ دل میں پیدا ہونے والا خوف اس سے بالکل مختلف ہے اور اسی لئے یہاں لفظ **خوف** استعمال نہیں فرمایا بلکہ **وجل** کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا ترجمہ مطلق خوف نہیں بلکہ وہ ہیبت ہے جو بڑوں کی جلالت شان کے سبب دل میں پیدا ہوتی ہے۔

دوسری صفت ایمان میں ترقی

مومن کی دوسری صفت یہ بتلائی کہ جب اُس کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اُس کا ایمان بڑھ جاتا ہے، ایمان بڑھنے کے ایسے معنی جن پر سب علماء مفسرین ومحدثین کا اتفاق ہے یہ ہیں کہ ایمان کی قوت وکیفیت اور نورِ ایمان میں ترقی ہوجاتی ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اعمالِ صالحہ سے ایمان میں قوت اور ایسا شرح صدر پیدا ہوجاتا ہے کہ اعمالِ صالحہ اُس کی عادت طبعی بن جاتے ہیں جس کے چھوڑنے سے اُس کو تکلیف ہوتی ہے اور گناہ سے اُس کو طبعی نفرت پیدا ہوجاتی ہے کہ ان کے قریب نہیں جاتا، ایمان کے اسی مقام کو حدیث میں حلاوتِ ایمان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ مؤمن کامل کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ جب اُس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جائیں تو اُس کے ایمان میں جلا وترقی ہو اور اعمالِ صالحہ کی طرف رغبت بڑھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس طرح عام مسلمان قرآن پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں کہ نہ قرآن کے ادب واحترام کا کوئی اہتمام ہے نہ اللہ جل شانہ کی عظمت پر نظر ہے ایسی تلاوت مقصود اور اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والی نہیں گو ثواب سے وہ بھی خالی نہ ہو۔

تیسری صفت اللہ پر توکل

مومن کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے، توکل کے معنیٰ اعتماد اور بھروسہ کے ہیں مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال واحوال میں اُس کا مکمل اعتماد اور بھروسہ صرف ذاتِ واحد حق تعالیٰ پر ہو، صحیح حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اپنی ضروریات کے لئے مادی اسباب اور تدابیر کو ترک کرکے بیٹھ جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی اسباب وآلات کو اصل کامیابی کے لئے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت وہمت مادی اسباب اور تدابیر فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد

کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اُسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اُن اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں، ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے، ایک حدیث میں فرمایا اجملو فی الطلب و توکلوا علیہ یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لئے متوسط درجہ کی طلب اور مادی اسباب کے ذریعہ کوشش کرلو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو اپنے دل ودماغ کو صرف مادی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ الجھا رکھو۔

چوتھی صفت اقامت صلوٰۃ

چوتھی صفت مومن کی اقامتِ صلوٰۃ بتلائی اس میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کا نہیں بلکہ نماز کی اقامت کا ذکر ہے، اقامت کے لفظی معنی کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں، مراد اقامت صلوٰۃ سے یہ ہے کہ نماز کے پورے آداب وشرائط اُس طرح بجالائے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قول وعمل سے بتلائے ہیں، آداب وشرائط میں کوتاہی ہوئی تو اُس کو نماز پڑھنا تو کہہ سکتے ہیں مگر اقامتِ صلوٰۃ نہیں کہہ سکتے۔

پانچویں صفت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

پانچویں صفت مردمؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُس کو رزق دیا ہے وہ اُس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے، یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا عام ہے تمام صدقات وخیرات اور وقف وصِلہ رحمی کو جس میں زکوٰۃ وصدقۃ الفطر وغیرہ واجبات شرعی بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات وتبرعات بھی، مہمانوں، دوستوں، بزرگوں کی مالی خدمت بھی۔

مردِ مومن کی یہ پانچ صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یعنی ایسے ہی لوگ سچے مومن ہیں جن کا ظاہر وباطن یکساں اور زبان ودل متفق ہیں ورنہ جن میں یہ صفات نہیں وہ زبان سے تو اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا رّسول اللہ کہتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں نہ توحید کا رنگ نہ اطاعت رسول، اُن کے اعمال اُن کے اقوال کی تردید کرتے ہیں، اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے جب وہ حاصل نہ ہو حق حاصل نہیں ہوتا۔

آیاتِ مذکورہ میں سچے مؤمن کی صفات وعلامات بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ اس میں سچے مؤمنین کے لئے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا، ایک درجاتِ عالیہ، دوسرے مغفرت، تیسرے رزق عمدہ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو کمالِ ایمان کی صفات سے مالامال فرمائے۔ آمین

(ملخص از معارف القرآن: ۳/۱۷۹ تا ۱۸۳)

درسِ حدیث

جو قوم موت کا خوف دل میں رکھتی ہے

مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ

عَنْ ثَوْبَانَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: يُوْشَكُ الأمَمُ أَنْ تَدَاعىٰ عَلَيْكُمْ، كَما تَدَاعَى الأُكِلَةُ إِلىٰ قَصْعَتِهَا. فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِن قلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ، وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيلِ، وَلَيَنْزَعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمْ المَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِي قُلُوْبِكُمْ الوَهَنَ. فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَمَا الوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْيَا، وَكَرَاهِيَّةُ المَوْتِ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی دلائل النبوۃ، مشکوٰۃ ص: ۴۵۹)

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ وقت قریب ہے کہ تمہاری مثال اس پیالہ کی سی ہوگی جس میں تیار شدہ کھانا موجود ہو اور لوگ اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو یہ کہہ کر دعوت دیں کہ آؤ بھائی! اس کو کھالو، اس پر ایک شخص نے تعجب سے کہا کیا لوگوں کو یہ جرأت اس لئے ہوگی کہ ہماری تعداد اس زمانہ میں بہت کم ہوجائے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں نہیں! اس دن عدد کے لحاظ سے تم بہت ہوگے لیکن تمہاری مثال اس خس وخاشاک کی سی ہوجائے گی جو بارش کے بہتے ہوئے پانی کے اوپر تیرتا نظر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے (تمہاری بداعمالی کی بدولت) تمہارا خوف اور رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں الوھن کا روگ ڈال دے گا، ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ الوھن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کی محبت اور موت کا خوف۔

تشریح: موجودہ دور میں مسلمان اپنے دشمنوں کے درمیان جس طرح گھرے ہوئے ہیں اور ہر طرف سے ان کو عالم سے نیست ونابود کرنے کے لئے جس طرح دشمنوں کی نظریں بڑی لاپروائی کے ساتھ ہماری طرف لگ رہی ہیں، ان کا سب سے سچا فوٹو کیا ان الفاظ سے زیادہ بہتر طریقہ سے کھینچا جاسکتا ہے جو حدیث بالا میں مذکور ہوئے؟ حیرت یہ ہے کہ ہماری پستی ونکبت کا یہ فوٹو ایسی طاقت کے زمانہ میں کھینچا جارہا تھا جب کہ اس بات

کا سمجھنا مخاطبین کو اتنا بعید معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سبب پوچھے بغیر آخر کار ایک شخص سے رہا نہ گیا، پھر جن کے سامنے امت کے عروج وزوال کے تمام دور وحی کے قطعی اور یقینی ذریعہ سے سب کے سب کھول کر رکھ دیئے گئے تھے، انھوں نے ہمارے اس روگ کی کتنی صحیح تشخیص کی، پھر کتنی مختصر کہ صرف دو لفظوں میں اس کا لب لباب نکال کر رکھ دیا۔

اگر آج ہم میں حدیث وقرآن پر یقین کی روح موجود ہوتی تو ہم اسلام کے ایک اسی لفظ پر قربان ہو جاتے، کیا یہ بات نہیں کہ ہماری تعداد بحمد اللہ تعالیٰ اس وقت دنیا میں بہت بڑی تعداد ہے؟ لیکن اس کے ساتھ اگر آپ ہمارے اسلام کو کسوٹی پر کس کر دیکھیں تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ ہمارا دعوائے اسلام گو بہت بلند آہنگی کے ساتھ ہو رہا ہے لیکن اس میں حقیقت اتنی بھی نہیں ہے جتنی حدیث کے لفظوں میں خس وخاشاک کی ہوتی ہے۔ کیا آج ہمارے دلوں میں بلکہ روئیں روئیں میں مال کی محبت گھسی ہوئی نہیں ہے؟ کیا ہم کبھی یہ احتیاط رکھتے ہیں کہ جس مال کی محبت میں فنا ہو رہے ہیں وہ حلال راستہ سے آتا ہے یا حرام راستہ سے؟ ظلم وعدوان کی راہ سے حاصل ہو رہا ہے یا عدل وانصاف کی راہ سے؟ یا آنکھ میچ کر صرف اس کو سمیٹنے میں مشغول ہیں خواہ اس میں ہمیں اپنے ملک وقوم کو کھو دینا ہی کیوں نہ پڑے؟ پھر اسی کے ساتھ اپنے دلوں کی طرف غور کر کے دیکھئے کہ ان میں موت سے خوف کتنا پیدا ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مال ودولت کی محبت کے ساتھ جاں فروشی کی روح کبھی پیدا نہیں ہو سکتی، اس لئے اگرچہ یہاں ''موت کا خوف'' اور ''مال کی محبت'' یہ لفظ تو دو ہیں مگر ان کی حقیقت ایک ہی ہے اور جب اس کا احساس دشمنوں کو ہو جاتا ہے کہ کسی قوم میں جاں فروشی کے بجائے عیش پرستی کی روح داخل ہو چکی ہے تو پھر فطرتاً ان کے دلوں سے ایسی قوم کا رعب وخوف نکل جاتا ہے اور یہی دشمنوں کی دلیری کا باعث بن جاتا ہے۔

مشترکہ ہند میں گذشتہ دور میں مسلمانوں کے ساتھ کتنے ہی معرکے پیش آئے جن میں مسلمان نہتے تھے اور مال ودولت کی نعمت سے بھی محروم تھے لیکن جب جنگی سرگرمیوں نے ایک بار یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں ابھی جاں فروشی کی روح باقی ہے تو ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ایسا طاری ہوا کہ وہ بتیس دانتوں میں ایک زبان ہو کر سالہا سال آرام کی نیند سو یا کئے، کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی کمزوریوں کا احساس کریں اور مرض وعلاج کی صحیح تشخیص وتجویز کے بعد بھی اس کے معالجہ کی طرف متوجہ نہ ہوں، فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو) (پارہ ۲۸ رکوع ۴)

اس ضمن میں یہ تنبیہ کر دینی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے قرآن کریم نے جو حکم

مسلمانوں کو دیا ہے وہ یہ ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ اور تیاری کرو ان کے ساتھ لڑائی کے لئے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک بیٹھ جائے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر‘‘ (پارے ۱۰ رکوع ۴) یعنی کفار کے لئے جو قوت بھی تم تیار کر سکتے ہو اس کی تیاری میں لگے رہو۔

ان میں سے اس وقت کی لحاظ سے ایک بات یہ ہے کہ جہاد کرنے کے لئے گھوڑے بھی پالو، یہ سب تیاری اس مقصد کے لئے ہے کہ دشمنوں پر رعب جمے اور تمہاری دھاک ان پر بیٹھی رہے، اس لحاظ سے ہر زمانہ میں جو آلاتِ جدیدہ ایجاد ہوں گے ان کو بھی زیادہ سے زیادہ جمع کرنا اسی آیت کے حکم میں داخل ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے اعلاء کلمۃ اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ سپاہیانہ زندگی اور فوجی ٹریننگ ہے اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ عیش پرستی کی زندگی چھوڑ کر ایک فوجی جوانمرد بنے اور جتنا آج وہ مادی ترقیات کے پیچھے پڑا ہوا نظر آتا ہے اتنا ہی فوجی ٹریننگ حاصل کرنے کا شوقین نظر آئے کیوں کہ جو شخص خود اپنے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ دین وملک کی حفاظت کیا کرے گا؟

دنیا میں ملٹری (Military) اور سویلین (Civilian) کی تقسیم علیحد علیحدہ ہے لیکن اسلام میں ہر مسلمان جس طرح نماز اور روزہ کا مخاطب ہے اسی طرح وہ جہاد کا بھی مخاطب ہے؛ لیکن آہ! اسلام سے غفلت کے بدولت ہماری ترقی کی راہیں مسدود ہیں کہ آج اگر ہماری پبلک سب کی سب مسلح کردی جائے جیسا کہ عہدِ سلف میں رہا کرتی تھی، تو شاید سب سے پہلے مسلمان کا ہتھیار مسلمان کے مقابلے میں گھر گھر اس طرح استعمال ہونے لگے کہ تعدد ازدواج اور برتھ کنٹرول (Birth Control) کے مسائل پر غور کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے

کتنا افسوس ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم میں کا ایک ایک مسلمان مسلّح تھا، ہم میں کا ایک ایک فرد بہادری اور طاقت میں رُستم واسفندیار تھا، لیکن جب کبھی مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی نوبت آتی تو ہم ہی سب سے زیادہ نہتے اور سب سے زیادہ بُزدل نظر آتے تھے، پھر جب عالم کے انقلابات نے نقشہ بدلا اور خون ریزی کا بازار خود مسلمانوں کے درمیان گرم ہوا تو اسی دن سے ہمارا دور انحطاط شروع ہو گیا۔ اور بدقسمتی سے وہ انحطاط صرف ملکی نہ تھا بلکہ اس سے زیادہ دینی تھی اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہم جو کبھی مخلوقِ خدا کا بوجھ اُٹھایا کرتے تھے، خود اپنا بوجھ بھی اُٹھانے کے قابل نہ رہے، اور اپنے دشمنوں سے بھیک مانگ مانگ کر بڑی ذلت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

وقت اب بھی نہیں گیا ہے اگر ہم آج بھی مل کر قرآن کریم کی آیتوں پر صحیح صحیح عمل کرنا شروع کردیں تو ہمارے دن پھر جائیں، اور ہم اسی عزت کی حیات کے مالک نظر آئیں۔

پیش گفتار

نصیحت نامہ برائے طلبۂ مدارس دینیہ

از:
حضرت حکیم محمد کلیم اللہ صاحب مدظلہ العالی
ناظم مدرسہ اشرف المدارس ومجلس دعوۃ الحق ہردوئی

حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ العالی جانشین محی السنہ حضرت ہردوئی رحمہ اللہ اکابر اولیاء میں سے ہیں، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور کے رکنِ شوریٰ بلکہ سرپرستِ اعلیٰ ہیں، حضرت نے اواخر سال میں طلبۂ مدارس کے لئے ایک خصوصی نصیحت ووصیت مرتب کرکے دارالعلوم دیوبند روانہ فرمائی تھی، اس عاجز کی حاضری پر اس کا مضمون خادم سے پڑھ کر سنوایا تھا، اب چوں کہ نیا تعلیمی سال شروع ہونے جارہا ہے اشرف الجرائد کے ذریعہ تمام طلبۂ مدارس کے لئے یہ قیمتی نصیحتیں پیش ہیں، اہم امور ہیں ملحوظ رکھیں گے تو بہت نفع ہوگا۔　مدیر

عزیزانِ قلبی وروحی طلبہ کرام زید رشدھم وفضلھم دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند معروضات بطور نصیحت ووصیت پیش ہیں:

۱) **تحصیل علم میں انہماک:** آپ حضرات دور دراز سے طلب علم کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اس موقع کو غنیمت جانیں، خوب مستعدی اور یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول رہیں، جس فن سے بھی مناسبت ہو اس میں اختصاص اور مہارت حاصل کریں، ساتھ ہی ساتھ تصحیح نیت کا بھی اہتمام ہو۔

۲) **علم پر عمل:** علم کی بقا عمل سے ہے، ابھی سے اس کی کوشش کریں اور یہ چیز بدون صحبت کے ناممکن

ہے، حق تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے آپ کو ایسے صاحبِ نسبت اساتذہ و اکابر عطا فرمائے ہیں جو اذا رئو وا ذکر اللہ کا مصداق ہیں، ان کی قدر کریں، ان سے استفادہ کریں، ابھی سے کوئی مصلح تلاش کر کے ان سے وابستہ ہو جائیں اور ان کی ہدایات پر عمل کریں، کتابوں سے لفظی علم تو حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس میں جلا بدون صحبتِ کاملین کے ناممکن ہے، اسی وجہ سے ہمارے اکابرین نے اس کا حد درجہ اہتمام فرمایا ہے، قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتویؒ قطبِ عالم حضرت گنگوہیؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور ان کے علاوہ تمام ہی اکابر کی زندگی ہمارے لئے قابل تقلید ہے، باوجود یہ کہ یہ حضرات علومِ ظاہرہ میں اپنی مثال آپ تھے لیکن تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کو ضروری سمجھ کر کسی صاحبِ نسبت سے منسلک ہوئے اور ان کی ہدایات پر عمل فرمایا جس کی برکت سے وہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور پوری دنیا ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہو رہی ہے۔

۳) **نماز با جماعت کا اہتمام:** کوشش کریں کہ پنج وقتہ نماز تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ ادا ہو، تھوڑی سی توجہ اور ہمت سے کام لیں تو اس پر عمل کچھ مشکل نہیں، نیز قیام اللیل کا بھی اہتمام ہو، حدیث شریف میں اس کے بہت فضائل اور تاکید آئی ہے، علیکم بقیام اللیل کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

۴) **موبائل کے استعمال سے اجتناب:** دورانِ طالب علمی موبائل کے استعمال سے بچنے کا خاص اہتمام کریں، بالخصوص جس موبائل میں انٹرنیٹ کی سہولت ہو، اس کا استعمال انتہائی مضر ہے، تعلیمی یکسوئی میں خلل ہوتا ہے۔

۵) **اشاعتِ دین:** حصولِ علم کا مقصد تبلیغ اور اشاعت ہے، ابھی سے نیت کریں کہ تحصیل علم کے بعد اس کی اشاعت میں لگنا ہے، جس نوع سے بھی ہو قلم کے ذریعہ یا زبان کے ذریعہ، انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر یہ فتنوں کا دور ہے، امت کو صحیح رہبری و رہنمائی کی سخت ضرورت ہے، اور یہ کام حضرات علماء کرام ہی کے ذمہ ہے ، اور انتہائی عظیم الشان ہے، اس کو سیکھنا اور اس کے آداب اور تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے، مبلغ کے لئے تین چیزیں لازم ہیں: مردم شناسی، حرف شناسی، موقع شناسی، مخاطب کے مرتبہ کی رعایت، اندازِ گفتگو، مناسب موقع، قرآن مجید میں جا بجا اس کے نمونے موجود ہیں، سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے ظالم و جابر سے گفتگو کے وقت قولِ لین کا حکم اور امام الانبیاء سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کی تاکید اس کی واضح مثال ہے، بسا اوقات ان تینوں میں سے کسی ایک بات کی بھی عدم رعایت بجائے نفع کے ضرر کا باعث ہوتی ہے۔

نیز اس کا بھی خیال رہے کہ دین کی بات سنانے کے بعد کوئی تحفہ قبول نہیں کریں، حکیم الامت حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے میرے شیخ شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کو یہی نصیحت فرمائی تھی کہ دین کی باتیں سنانے کے بعد کبھی ہدیہ مت لینا، زادِ راہ لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

۶) **تنقید و تنقیص سے اجتناب:** آج کل یہ مرض حضراتِ اہلِ علم میں عام ہوتا جارہا ہے، یہ سمِ قاتل ہے، کوئی بات قابلِ اصلاح اور توجہ طلب ہو یا خلافِ تحقیق ہو تو مناسب عنوان سے اس کی اطلاع کردی جائے، منکر پر نکیر ہو لیکن تحقیر نہ ہو تنقید و تنقیص اہل علم کے لئے زیبا نہیں، اسی لئے اپنے اہل علم احباب کو آج کل یہ نصیحت کرتا ہوں ''نہ زبان بہکے نہ قلم بہکے''

مذکورہ بالا امور پر عمل سے انشاء اللہ دنیا میں بھی سکون و عافیت کی زندگی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی سرخ روئی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ تمام کو علم نافع عطا فرمائے، عالم باعمل بنائے، ترقیات سے نوازے ،آپ کے جملہ مقاصد کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں۔

والسلام

محمد کلیم اللہ عفی عنہ

۲۱/ جمادی الثانیہ ۳۹ ھجری

مطابق ۱۰/ مارچ ۱۸ء

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

☆حضرت ام حرامؓ بنت ملحان بن خالد بن زید

یہ حضرت ام سلیمؓ کی بہن، حضرت انسؓ کی خالہ، عبادہ بن صامتؓ کی زوجہ ہیں، نہایت باکمال عورت تھیں۔

نبی کریم ﷺ کا اس گھرانے کے لئے خیر و برکت کی چاہت:

حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں: ہمارے یہاں نبی کریم ﷺ تشریف لائے، میں، میری والدہ محترمہ اور میری خالہ جان ام حرامؓ موجود تھے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ، تم کو نماز پڑھاتا ہوں، نبی کریم ﷺ نے ہمارے گھر میں ہمیں نماز کے اوقات کے علاوہ میں نماز پڑھائی۔

نبی کریم ﷺ کی حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کے لئے دعائے برکت:

حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ مجھ سے ام حرام بنت ملحانؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ ان کے گھر پر قیلولہ فرمایا، نبی کریم ﷺ جب بیدار ہوئے تو مسکرانے لگے، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟ فرمایا: مجھ پر میری امت کے کچھ وہ لوگ پیش کئے گئے جو اس سمندر کی پشت پر سواری کر رہے ہیں، ایسے جیسے بادشاہ سواریوں پر سواری کرتے ہیں۔ میں نے کہا: یا رسول ﷺ! میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ اللہ عز وجل مجھے ان میں شامل فرما دے، فرمایا: ''تم ان میں سب سے آگے رہوگی''

مجاہد شوہر اور بیوی:

ان کا نکاح پہلے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ہوا، ان کے ساتھ انہوں نے سمندر کا سفر کیا، ان سے یہ حاملہ ہوئیں، جب ان کی واپسی ہو رہی تھی تو یہ خچر پر سوار ہونے لگیں تو اس نے ان کو گرا دیا، جس کی وجہ سے ان کی گردن ٹوٹ گئی، اور ان کا انتقال ہو گیا۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ غزوہ قبرص تھا (یہ جزیرہ آج بھی قبرص (Cyprus) کے نام سے مشہور ہے، اس لشکر کی امارت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی، اس میں ابوذر ؓ، ابودرداء ؓ وغیرہ صحابہ کرام شامل تھے، یہ سن ۲۷ ہجری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کا واقعہ ہے، آج بھی ان کی قبر موجود ہے۔

☆ام ہانی رضی اللہ عنہا

یہ سیدہ فاضلہ، ہاشمیہ، مکیہ، مسمی ام ہانی ؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چچا ابوطالب کی بیٹی تھی اور حضرت علی وحضرت جعفر رضی اللہ عنہما کی بہن تھی، ہبیرہ بن عمرو بن عائذ مخزومی کی زوجیت اور نکاح میں تھیں، وہ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئیں، اور ان کے شوہر نجران بھاگ گئے، ان کی اولاد میں عمرو بن ہبیرہ، جعدہ، ہانی اور یوسف تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ام ہانی ؓ کا استقبال اور ان کے پناہ دیئے ہوئے شخص کو پناہ دینا:

ابوالنضر عمر بن عبید اللہ کے مولی (غلام) ابومرہ ـــ جو ام ہانی ؓ کے غلام تھے ـــ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کو یہ کہتے ہوئے سنا: میں فتح مکہ کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں گئی، تو آپ غسل فرمارہے تھے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کپڑے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پردہ کی ہوئی تھیں، میں نے سلام کیا تو فرمایا: کون؟ میں نے کہا: میں ام ہانی بنت ابوطالب ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ام ہانی تمہیں مبارکبادی ہو'' جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آٹھ رکعتیں صرف ایک کپڑے میں ادا فرمائیں، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے بھائی یعنی حضرت علی ؓ اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں جس کو میں نے میں پناہ دی ہے، یعنی فلان بن ہبیرہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اس کو پناہ دی ہے جس کو ام ہانی ؓ نے پناہ دی ہے'' یہ چاشت کا وقت تھا۔

کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پیغام نکاح دیا؟

ایک قول اس حوالہ سے یہ ہے کہ ام ہانی ؓ کے اسلام لانے کے بعد ان کی ہبیرہ سے علاحدگی ہوگئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو پیغام نکاح دیا، انہوں نے کہا کہ میں آل واولاد والی عورت ہوں (یعنی میرا اکثر وقت بچوں کی دیکھ بھال میں گذرتا ہے، میں شوہر کے حقوق کی پاسداری نہیں کر پاؤں گی) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت اختیار فرمایا۔

وفات:

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سن پچاس کے بعد انتقال فرماگئیں۔

اصلاحی مضامین

عید الفطر کا پیام ملت اسلامیہ کے نام!

از: مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

تہوار، ہر قوم کی سماجی زندگی کا ایک اہم عنصر اور لازمی جزء ہے، اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر دین و مذہب اور معاشرہ و سماج میں کوئی نہ کوئی دن ایسا ضرور مقرر تھا؛ جسے لوگ اپنے اپنے عقائد، تصورات، روایات اور ثقافتی اَقدار کے مطابق مناتے تھے، مورخین لکھتے ہیں کہ ایرانی، فریدون بادشاہ کی فتح عظیم کی یاد میں ''مہرجان'' نامی تہوار مناتے تھے، اہل مصر عہد قدیم سے ''نوروز'' نامی عید مناتے تھے: جسے قرآن مجید میں یوم الزینۃ سے تعبیر کیا گیا، بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر فرعون کے مظالم سے یومِ نجات کو یومِ عید بنا رکھا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی شہر سے باہر اکھٹا ہو کر پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنا تہوار مناتی تھی۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تصورِ عید انسانی فطرت کا تقاضا اور تہذیب و ثقافت کا مشترک حصہ ہے؛ مگر چوں کہ غیر مسلم اور قدیم قومیں اپنے سامنے کوئی نظریہ نہیں رکھتیں؛ اس لئے ان کی یہ عیدیں لہو و لعب، رقص و سرود اور ناؤ و نوش کے سوا کچھ نہیں ہوتیں اس کے برعکس اسلام دین فطرت ہے، اس نے اپنے نام لیواؤں کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے خوشی و مسرت کے دو تہوار عنایت کئے؛ جن کو عربی میں عید کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

''عید'' کا لفظ ''عوذ'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنیٰ ''لوٹنے'' کے ہیں، چوں کہ یہ دن مسلمانوں پر بار بار لوٹ کر آتا ہے اور ہر مرتبہ نئی نئی خوشیاں ساتھ لاتا ہے، اس لئے اس کو عید کہتے ہیں۔

اسلام میں عید کا آغاز:

خالص اسلامی فکر اور دینی مزاج کے مطابق اسلامی تمدُّن اور اجتماعی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد مدینۂ منوّرہ میں ہوا۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں عیدین کا مبارک سلسلہ شروع ہوا،

* استاذ شعبہ عالمیت ادارۂ ہٰذا

جس کا تذکرہ سنن ابی داؤد کی مندرجہ ذیل حدیث میں ملتا ہے۔ ’’حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ اہلِ مدینہ دو دن بطورِ تہوار منایا کرتے تھے جن میں وہ کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان سے پوچھا: ’’یہ دو دن جو تم مناتے ہو، ان کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟‘‘ (یعنی ان تہواروں کی اصلیت اور تاریخی پس منظر کیا ہے؟) انہوں نے عرض کیا کہ ہم عہدِ جاہلیت میں (یعنی اسلام سے پہلے) یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں تہواروں کے بدلے میں تمہارے لیے ان سے بہتر دو دن مقرر فرما دیئے ہیں اور وہ ہیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ‘‘۔

ان اسلامی تہواروں کی اپنی جداگانہ اور امتیازی شان ہے، غیر مسلم اَقوام اپنے ایامِ عید میں اعتدال کی حدوں کو پھلاند کر عیش وعشرت، مستی وطرب، رنگ وناچ میں مشغول ہو جاتی ہیں؛ کیونکہ ان کے نزدیک حاصل زندگی بس یہی کچھ ہے؛ لیکن اس کے برخلاف مسلمانوں کی دونوں عیدیں جب شروع ہوتی ہیں، تو اُس دن کا آغاز دو رکعت نمازِ عید سے ہوتا ہے اور مسلمان یہ نماز ادا کر کے اس بات کا عملی اظہار کرتے ہیں کہ ہماری عید صرف وہی ہے؛ جس میں ہمارے رب تعالیٰ جل شانہ کی خوشنودی اور رضامندی ہو؛ اس لئے کہ جس بندے سے اُس کا خالق ومالک ناراض ہو اس کیلئے بھلا خوشی کا کیا مطلب اور مسرت کا کیا موقع؟؟

اسلام نے خوشی اور مسرت کے اظہار سے منع نہیں کیا اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ دینی زندگی اختیار کرنے کا مطلب صرف خشک مزاجی اور روکھا پن ہے تو ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرے، جہاں اُسے زندگی اپنی تمام تر حقیقی رعنائیوں اور خوبصورت رنگینیوں کے ساتھ نظر آئے گی۔ خوش مزاجی، اعلیٰ ظرفی، خندہ پیشانی، ہمدردی ورواداری، دائمی تبسم وغیرہ یہ سب کچھ اُس نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کے ہر ورق پر ہمیں مل جائے گا؛ جنہیں قیامت تک کے انسانوں کیلئے ’’اسوۂ حسنہ‘‘ قرار دیا گیا؛ البتہ اسلام نے ایسی تفریحات سے ضرور روکا ہے جو معاشرے میں خرابیوں کے جنم لینے کا باعث بنیں یا اُن سے کسی قسم کی اخلاقی بے راہ روی پیدا ہو۔

عید الفطر کا پس منظر:

جب بندہ تیس دن تک لگاتار روزے رکھتا ہے، اس کے عملی تقاضے پورے کرتا ہے اور اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فریضۂ صوم کی ادائیگی کے بعد اسے اپنی اطاعت شعاری کا ظاہری بدلہ اور نقد انعام عید الفطر کی شکل میں عنایت فرماتا ہے؛ جس طرح فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد عید الاضحیٰ کی شکل میں خوشی ومسرت کا موقع دیا جاتا ہے۔

اس دن جب بندہ کو مزدوری ملتی ہے تو اس کے صحن میں بے پناہ خوشیاں رقص کرنے لگتی ہیں، وہ مختلف شکلوں میں اس کا اظہار کرتا ہے اور اس خوشی میں اپنے دوستوں اور گھر والوں کو بھی شریک کرتا ہے اس طرح عید کے دن انعام یا مزدوری ملنے کے بعد یہ بندہ اپنے احباب اور اہل خانہ کے ساتھ اپنی مسرتوں کو تقسیم کرتا ہے۔

یہ ہماری اس اخروی مزدوری کی ہلکی سی جھلک اور ادنیٰ سا مظہر ہے؛ جس کا اللہ عزوجل نے ہم سے وعدہ فرما رکھا ہے۔

عید کا مقصد:

مفکر اسلام علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:''اللہ جلّ شانہٗ نے فرضیت صیام کا مقصد بیان کرنے کے بعد اگلی آیت میں عید کا بھی ذکر فرمایا؛ جس میں عید کا نام تو نہیں آیا، لیکن عید کا منشا، عید کا مقصد، عید کا وظیفہ اور عید میں کرنے کا کام، یہ سب اس میں آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان میں روزہ کی توفیق دی لہذا جب رمضان آئے اور خیریت کے ساتھ، توفیق الٰہی کے ساتھ، دن کے روزوں کے ساتھ، رات کی عبادتوں کے ساتھ گذر جائے تو'' وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ '' اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اللہ نے ہدایت دی، ایمان واسلام کی دولت سے نوازا اور پھر توفیق دی، اگر ان میں سے ایک چیز بھی نہ ہوتی تو کہاں کا رمضان اور کہاں کا روزہ، دنیا میں پچاسوں قومیں ہیں، سیکڑوں افراد ہیں وہ اتنا جانتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ مسلمانوں میں آتا ہے، جیسے ہمارے یہاں مہینہ آتا ہے، انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب رمضان آیا اور کب ختم ہو گیا اور ان کے مہینوں اور رمضان میں کیا فرق ہے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی؛ اس لئے اس کی بڑائی بیان کی جائے اور زیادہ سے زیادہ تکبیر کہی جائے اور مسنون بتلایا گیا کہ ایک راستہ سے آئے اور دوسرے راستہ سے جائے، تاکہ ساری فضا اس سے معمور ہو جائے اور وہاں رہنے والوں کے کانوں میں یہ آواز پڑ جائے اور دوسری چیز '' وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ '' تاکہ تم شکر کرو یعنی اللہ نے ہمیں جو نیک فیق دی اور ہم سے روزے رکھوائے اس پر ہم اللہ کا شکر بجالائیں اور دوگانہ اس کی بارگاہ میں ادا کریں''۔ (تلخیص؛ عید الفطر کا پیغام)

پیامِ عید:

عید الفطر کی ساری فضیلتیں اور برکتیں اپنی جگہ؛ لیکن اس مبارک دن کا سب سے عظیم فلسفہ اور اہم ترین سبق یہ ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اپنی خوشی میں شریک کیا جائے، اپنے پڑوسیوں، رشتے داروں، خاندان والوں، غریبوں اور مفلسوں کا خاص خیال رکھا جائے۔

عیدالفطر کے مقاصد ومصالح کا بہ نظر غائر جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا بجا ہے کہ ہماری عید، اللہ عزوجل کے نزدیک اسی وقت مقبول ہوگی جب ہم غریبوں کو گلے لگائیں گے، یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیریں گے، محتاجوں کی مدد کریں گے اور اپنی اپنی استطاعت کے مطابق مستحقین پر خیرات، صدقات اور عطیات کر کے ان کو بھی خوش کریں گے اور اپنے مولیٰ کو بھی راضی کریں گے۔

اس کے علاوہ عیدالفطر کا عظیم تہوار وسیع پیمانے پر اخوت و بھائی چارے اور اتحاد اتفاق کا درس بھی دیتا ہے۔

نماز عید میں امت مسلمہ کا غیر معمولی ہجوم اسلام کی حقانیت وسربلندی اور مسلمانوں کی اجتماعیت ووحدت کا دل کش منظر پیش کرتا ہے جس میں تمام اہل ایمان کا رنگ ونسل کے فرق وامتیاز کے بغیر بڑا ایمان افروز اور روح پرور اجتماع ہوتا ہے اور اس میں امیر وغریب، حاکم ومحکوم، شاہ وگدا سب کے سب اکٹھے ہوکر نماز عید ادا کرتے ہیں اور ایک ہی وقت میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ایک ہی وقت میں سب کی زبان پر ایک ہی کلمہ............ایک ہی تلاوت............ایک ہی ذکر............ایک ہی تسبیح وتحمید اور ایک ہی دعاء ہوتی ہے۔ اسی اتحاد واتفاق سے مسلمانوں کے قلوب واذہان کو معمور کرنے کے لئے آج کے مبارک اور عظیم دن نمازِ عید کے اجتماع کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

عیدالفطر کے دن نماز عید کے علاوہ غربا ومساکین کی امداد وتعاون کرنا، بیماروں کی مزاج پرسی کرنا، دوستوں سے اظہار محبت کرنا، اپنے سے کمتروں اور زیردستوں کا خیال کرنا، بچوں سے شفقت ونرمی سے پیش آنا، بڑوں کی تعظیم کرنا، نرمی، رواداری اور بھائی چاری کا رویہ اپنانا یہ سب ہماری دینی اور اخلاقی ذمے داریاں ہیں جن سے عہدہ برآ ہوئے بغیر ہم اپنا دامن نہیں جھاڑ سکتے۔

اصلاحی مضامین

ماہِ رمضان کا اختتام......کیا کھویا کیا پایا؟؟

از: مولانا محمد انصار اللہ قاسمی*

احتساب اور جائزہ ایک کامیاب اور بامقصد زندگی کا لازمی حصہ اور وظیفہ ہے، اس کے بغیر انسان کی زندگی محض کھیل کود اور تماشہ ہے، زندگی میں مختلف مراحل اور مواقع آتے ہیں، عقل و دانائی اور دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ انسان ان مراحل و مواقع میں اپنا احتساب کرے اور جائزہ لے کہ ''میں نے کیا پایا ہے؟'' اور ''کیا کھویا ہے'' لائق اور باکمال انسان اپنی زندگی میں جب کوئی اقدام کرتا ہے یا کسی میدان میں قدم رکھتا ہے تو اپنے اندر ''پانے'' اور ''کھونے'' کے احساس کو ٹٹولتا اور جگاتا ہے، پانے اور کھونے کے اس احساس کی بنا انسان ترقی کے منازل طے کرتا ہے اور کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، غافل اور بے پروا انسان اس احساس سے محروم رہتا ہے، وہ زندگی کو حقیقت سے زیادہ ایک افسانہ سمجھتا ہے، ''کھاؤ پیو اور موج و مستی کرو'' یہی سوچ و فکر اس کے نزدیک زندگی کا دوسرا نام ہے، اس کو نہ اپنی زندگی کے فرائض و واجبات معلوم اور نہ ہی اپنی ذمہ داریوں کا احساس و شعور، غفلت، لاابالی اور لاپرواہی کا شکار انسان دنیا و آخرت دونوں جگہ نقصان و خسارہ کا خریدار ہے۔

بعض مرتبہ ''پانے'' کے مواقع و امکانات بہت کچھ ہوتے ہیں، غفلت کا مارا انسان ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے'' بیٹھا رہتا ہے، اور ان مواقع کو استعمال میں نہیں لاتا ہے، ان کے گذرنے اور ختم ہونے کے بعد اس کو ''کھونے'' کا احساس ہوتا ہے، پھر وہ سوائے ''ہاتھ ملنے'' کے اور کچھ نہیں کرسکتا ''اب پچھتائے کیا ہو جب چگ گئیں چڑیاں کھیت'' اس لیے وقت پر کھونے کا احساس ہونا مفید اور کارآمد ہے نہ کہ وقت گذر جانے کے بعد، دوسروں کی عیب جوئی، ان پر نکتہ چینی، ان کی خرابیاں اور خامیاں تلاش کرنا، ان کے کاموں اور حرکتوں کو تنقید و تبصرہ کا نشانہ بنانا، یہ سب باتیں اس لیے ہوتی ہیں کہ انسان خود کو احتساب اور محاسبہ سے ماوراء اور بلند سمجھتا ہے، قرآن مجید میں بتایا گیا کہ انسان کو خود اپنے بارے میں پوری واقفیت ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (سورۃ القیامۃ: ۱۴) وہ خود اگر اپنا بے رحم احتساب کرے اور بے لاگ جائزہ لے کہ میں نے زندگی کے مختلف شعبوں اور مرحلوں میں کیا پایا اور کیا کھویا ہے، تو اس کو اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کا اندازہ ہوگا، پھر وہ ان کو ختم کرنے اور

* آرگنائیزر مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ حیدرآباد

دور کرنے کی فکر کرے گا، دوسروں کی طرف دیکھنے اور نظر کرنے کی فرصت نہیں ہوگی۔ بقول بہادر شاہ ظفرؒ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں خبر
رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو جہاں میں کوئی بُرا نہ رہا

اپنا احتساب اور جائزہ ایک سچے مسلمان کے اندر آخرت کی فکر اور تیاری کو بڑھاتا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ نیکی کو پانے اور اس کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے، وہ اپنے کو ہمیشہ خیر و بھلائی کے کاموں میں لگا کر ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، قرآن مجید میں زور دے کر فرمایا گیا کہ ہر شخص دیکھے اور جائزہ لے کہ اس نے اگلے دن کی کیا تیاری کی ہے؟ یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (سورۃ الحشر: آیت ۱۸) دانشوری اور ہوشیاری یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے کے بجائے اپنا جائزہ لے، اپنے کو پہچانے اور موت کے بعد والی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کی فکر کرے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ (ریاض الصالحین، ص: ۷۴، باب المراقبہ) ہوشیار اور دانا وہ ہے جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا اور موت کے بعد (اخروی نجات و کامیابی) کے لیے عمل کیا، اور ناداں و ناتواں وہ ہے جو اپنے کو نفسانی خواہشات کا تابع بنائے اور اللہ سے امیدیں باندھے؛ اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے درس عبرت ہے جو اپنی عملی زندگی میں احکامِ خداوندی کی پامالی کرتے ہیں، آخرت کی فکر اور تیاری سے غافل ہو کر نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، پھر اس پر طرّہ یہ کہ بے عملی اور بے فکری کے باوجود اللہ تعالیٰ سے رحم و کرم کی امید بھی رکھتے ہیں، روک ٹوک کرنے پر کہتے ہیں، "اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے، اللہ کی رحمت وسیع ہے" ایسے لوگ دھوکہ میں ہیں اور ان کا انجام ناکامی اور نامرادی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے رحمت کی و مغفرت کی امید اس وقت صحیح اور معتبر ہے جب ساتھ میں کچھ عمل بھی ہو، بدعملی اور آخرت سے بے فکری کے ساتھ نجات و مغفرت کی امید باندھے رکھنا محض نفس کا دھوکا اور شیطان کا وسوسہ ہے، یوم آخرت اور اس دن اعمال کی جزا و سزا پر یقین رکھنے والے ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ آخرت میں حساب و کتاب کا معاملہ بھی درپیش ہوتا ہے، اس لیے اس مرحلہ کے پیش آنے سے پہلے دنیا میں اپنا محاسبہ کر لینا اور اپنی زندگی کا حساب و کتاب صاف کر لینا نیک بختی اور سعادت مندی کی علامت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا "اپنا محاسبہ کرتے رہو، اس سے پہلے کہ تمہارا حساب و کتاب لیا جائے"

دوسرے یہ کہ ’’پانے‘‘ اور ’’کھونے‘‘ کے احساس سے زیادہ ’’پانے‘‘ اور ’’کھونے‘‘ کا معیار زیادہ اہمیت رکھتا ہے، ہم پانا اس کو سمجھتے ہیں کہ قارون کا خزانہ ہمارے پاس ہو، کوئی ’’دفینہ‘‘ ہمارے ہاتھ لگ جائے، آرام اور راحت کے سامان اور عیش وعشرت کے اسباب پیدا ہو جائیں، اور کھونے کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم مادّی نعمتوں سے محروم ہوں، جن کے یہاں زندگی کی منزل صرف دنیا ہے اور دنیا بنانا اور کمانا ہی ان کا مقصد ہو تو ان کے نزدیک پانے کا یہی معیار اور کسوٹی ہے، لیکن جن کے پاس آخرت کا عقیدہ ونظریہ ہے اور وہ دنیا کو ایک اسٹیشن اور مسافر خانہ سے زیادہ کوئی مقام نہیں دیتے، ان کے نزدیک نیکی اور تقویٰ کے کاموں کی توفیق اور ان کے مواقع ہی ’’پانے‘‘ کا معیار ہے، حدیث میں دنیا کو آخرت کی کھیتی فرمایا گیا کہ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃ اس کھیتی میں اخلاص کی ’’کھاد‘‘ ڈال کر نیکی اور تقویٰ کے ’’بیج‘‘ بو کر آخرت میں نجات وکامیابی کی سرسبز وشاداب لہلہاتی ’’فصل‘‘ حاصل کرنا ان کی زندگی کا مقصد ومشن ہوتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے نزدیک پانے کا یہی وہ معیار تھا جس کی بنا پر وہ نیکی اور تقوی کے کاموں میں سبقت کرتے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر تعاون کی اپیل فرمائی، حضرت عمرؓ اپنے گھر کے ساز وسامان میں سے پورا نصف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا، اور یہ خیال فرما رہے تھے کہ آج کے دن میں ابوبکر صدیقؓ سے آگے بڑھ جاؤں گا، لیکن جب معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے گھر کا سارا ساز وسامان پیش کر چکے ہیں اور گھر میں صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام چھوڑ آئے ہیں تو حضرت عمرؓ نے کہا: میں کبھی ابوبکرؓ سے آگے نہیں بڑھ سکتا، خدا کی قسم ہجرت کے موقع پر غارِ ثور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ابوبکرؓ کی ایک ساعت کی رفاقت عمرؓ کی پوری زندگی سے بڑھ کر ہے، ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صحابہؓ میں سے فقراءِ مہاجرین حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ مالدار لوگ بلند درجات پانے اور ہمیشہ کی جنت حاصل کرنے میں ہم سے سبقت لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کیسے؟ فقراءِ مہاجرین نے کہا کہ جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں وہ بھی روزہ رکھتے ہیں، لیکن وہ صدقہ و خیرات کرتے ہیں ہم صدقہ وخیرات نہیں کر سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں ہم غلام آزاد نہیں کر سکتے، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں جس کے کرنے سے تم اپنے سے سبقت کرنے والوں کو پالو گے اور جو مالدار تمہارے بعد آئیں گے تم ان سے بھی سبقت کر جاؤ گے اور کوئی شخص تم سے آگے نہیں بڑھ پائے گا، مگر یہ کہ وہ بھی وہی کرنے لگے جو تم کرتے ہو؟ فقراءِ مہاجرین نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور بتلائیے! آپ نے فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو،

کچھ دنوں تک فقراءِ مہاجرین یہ عمل کرتے رہے، پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہمارے مالدار بھائیوں کو ہمارے عمل کی اطلاع ہوگئی اور وہ بھی ہمارا عمل کرنے لگے آپ ﷺ نے فرمایا: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ (ریاض الصالحین ،ص: ۲۵۵ باب فضل الغنی الشاکر) مطلب یہ کہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے نیکی وخیر کے کاموں کے زیادہ مواقع عطا کرتا ہے۔

اسی طرح صحابہ کرامؓ کے یہاں ''کھونے'' کا معیار یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق وتقویٰ اور خوف وخشیت کے معاملہ میں فرق آجائے، عالمِ آخرت اور اُس سے متعلق امور کے استحضار میں کمی آجائے، اس سلسلہ میں حضرت حنظلہؓ کی مشہور روایت ہے، فرماتے ہیں ایک دن ابوبکر مجھ سے ملے، اور پوچھا حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ حنظلہ منافق ہوگیا، انہوں نے فرمایا سبحان اللہ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا: بات یہ ہے کہ ہم جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ دوزخ اور جنت کا بیان کرکے ہم کو نصیحت فرماتے ہیں تو (خوف وخشیت کی وجہ سے) ہمارا یہ حال ہوجاتا ہے کہ گویا ہم دوزخ اور جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، پھر جب ہم آپ کی مجلس سے نکل کر آتے ہیں تو بیوی اور بچے زمین اور کھیتی باڑی کے کام ہم کو اپنی طرف متوجہ اور مشغول کرلیتے ہیں، اور پھر ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں، یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اس طرح کی حالت تو ہم کو بھی پیش آتی ہے، پھر یہ دونوں حضرات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کے سامنے اپنی اس حالت کو پیش کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تمہارا حال ہمیشہ وہ رہے جو میرے پاس رہنے سے ہوتا ہے اور تم ہمیشہ ذکر میں مشغول رہو، تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کیا کریں، لیکن اے حنظلہؓ! اللہ نے اس کا مکلف نہیں بنایا ہے، بس اتنا کافی ہے کہ انسانی ضرورتوں اور بشری تقاضوں کی بنا پر وقتاً فوقتاً یہ ہوتا رہے۔

(ریاض الصالحین ص: ۸۳ باب فی الاقتصاد فی الطاعۃ)

غرض یہ کہ ''پانے اور کھونے'' کا یہ احساس اور معیار ہے، اس کے مطابق صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیاں ہیں، یہ ہمارے لیے ''مشعلِ راہ'' ''مینارۂ نور'' اور ''نشانِ منزل'' ہیں، ان پاک وبرگزیدہ زندگیوں کو سامنے رکھ کر ہم جائزہ لیں کہ ہمارے نزدیک پانے اور کھونے کا معیار کیا ہے؟ اور اس معیار کے مطابق پانے اور کھونے کا احساس ہم میں کتنا اور کہاں تک ہے؟؟

رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں کا مبارک مہینہ ہم پر سایہ فگن ہے، کچھ دنوں بعد نیکیوں کا یہ موسمِ بہار ختم ہو جائے گا، قبل اس کے کہ رمضان کا مبارک مہینہ رخصت ہوجائے ہم اپنے اندر ''پانے اور کھونے'' کے احساس کو

جگائیں اور ٹٹولیں کہ اس ماہ میں کتنی نیکیاں ہمارے حصہ میں آئیں گی؟ نیکی اور تقویٰ کے کتنے کام ہم سے ہوسکیں گے؟ مادّی نعمتیں ہی اگر ''پانے'' کا معیار ہے تو ہم نے عام دنوں کی بہ نسبت اس ماہ میں بہت کچھ پایا، اصلی گھی، مغزیات اور مقویات سے بھرپور ہمہ اقسام کی حلیم ہم نے کھائی، افطار کے موقع سے پھل پھلاری اور فروٹ ہمارے پیٹ کا حصے بنے، لیکن سوچنے کی ضرورت ہے کہ کھانے کی لذتوں کی فکر اور تلاش میں کہیں ہم نے عبادت و بندگی کا لطف ومزہ تو نہیں کھودیا؟؟ اس ماہ میں خریداری کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے، ایک ایک فرد کے ایک ایک ایٹم کی خریداری کے لیے پورا ایک مہینہ لگ جاتا ہے، ''میاچنگ'' کی دیوانگی شہر کے تمام بازاروں کی سیر کراتی ہے، ہم خوش ہیں اور نازاں ہیں کہ ہم نے خوب جم کر خریداری کی، نت نئے ڈیزائن اور جاذب نظر ملبوسات ہماری زیب وزینت کا ذریعہ بنی، لیکن ...... یہ بھی تو دیکھیے! نرم وملائم نفیس ونازک کپڑوں اور سوٹ بوٹ کی خریداری میں کیا ہم نے ''لباس التقوی'' (تقویٰ کا لباس) بھی پایا ہے؟؟ تاجر حضرات اس پر شاداں اور فرحاں ہے کہ انہوں نے زیادہ وقت اور توجہ دے کر اپنے کاروبار کو خوب بڑھایا اور پھیلایا، عام مہینوں کی بہ نسبت اس ماہ میں آمدنی اور فائدہ زیادہ رہا، لیکن......غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر کاروبار کی وجہ سے انہیں نیکی اور تقویٰ کے کاموں کی فرصت نہیں ملی یا اس کی توفیق نہیں ہوئی تو یہ نفع، نفع ہے یا یہ کہ زبردست گھاٹا اور خسارہ بلکہ اپنی رہی سہی اور بچی کچھی نیکیوں کا بدترین دیوالیہ ہے؟؟

پس دنیاوی اور مادّی نعمتوں سے پرے ہوکر اپنا جائزہ لینے اور محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے کتنے دور ہم سے ختم ہوئے؟ نوافل اور تہجد کا اہتمام ہے کہ نہیں؟ افطار کے موقع پر رب کی بارگاہ میں دعاو مناجات ہوتی ہیں یا نہیں؟ اس کا بھی احتساب ہونا چاہیے کہ پہلے عشرے میں کونسے اعمال ہم نے کیے کہ اللہ کی رحمت ومہربانی ہم پر ہوسکے؟ دوسرے عشرہ میں ہم سے کتنے کام ایسے ہوئے کہ ہم خود کو مغفرت و بخشش کا مستحق ٹھہراسکیں؟ کیوں کہ اس شخص کے لیے زبردست وعید ہے کہ رمضان کا مہینہ پائے اور اپنی مغفرت کا سامان نہیں کرسکے۔

رمضان کا آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا ہوتا ہے، باتوفیق مسلمان جہنم سے آزادی پانے کے لیے ''اعتکاف'' کے عنوان سے خود کو اللہ کے گھر (مسجد) میں قید کرلیتے ہیں، خوف وامید کے ملے جلے احساس کے ساتھ اپنے پروردگار اور پالنہار کی چوکھٹ تھام لیتے ہیں کہ ''اب ہم تیری رضاء وخوشنودی اور اپنی نجات کا پروانہ لے کر ہی لوٹیں گے''، لیکن معاشرہ کی عمومی صورتحال یہ ہے کہ اس عشرہ میں مسلمان مساجد میں قید ہونے کے بجائے مساجد سے آزاد ہوجاتے ہیں اور نمازیوں کی تعداد بہت کم ہوجاتی ہے، پھر جب چاندرات ہوتی ہے تو

خریدوفروخت اپنے پورے عروج اورشباب پر ہوتی ہے، حدیث میں اس رات کو ''لیلۃ الجائزہ'' انعام کی رات فرمایا گیا، یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹا ہے، اس شب میں جائزہ (انعام) پانے کے بجائے عید کی تیاری و خریداری کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ کپڑے سل کر استری ہوئے کہ نہیں، سویاں اور خشک میوہ جات آ گئے کہ نہیں، دودھ وغیرہ کا انتظام ہوا کہ نہیں، اللہ رے! خدا تعالیٰ کی عنایات اور انعامات کی یہ نا قدری، فالی اللّٰہ المشتکی

خدا کرے کہ رمضان کے ان آخری دنوں میں اس کے برکات کو ''پانے'' کا کچھ جذبہ و احساس ہمارے اندر پیدا ہو اور جو کچھ ہم نے ''کھویا'' ہے اس کی تلافی ہو سکے۔

اصلاحی مضامین

مدارسِ اسلامیہ کا نیا تعلیمی سال: چند گذارشات

از: مولانا سید احمد ومیض ندوی*

دو ڈھائی ماہ کی طویل تعطیلات کے بعد مدارسِ اسلامیہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ہو رہا ہے، ہر طرف جدید وقدیم داخلوں کی ہماہمی ہے، بہت سے اداروں میں باقاعدہ تعلیم شروع ہوچکی ہے، اضلاع اور اطراف و اکناف کے تشنہ گانِ علوم اِن مدارس کا رخ کر رہے ہیں۔

مدارسِ اسلامیہ ملک وملت بلکہ انسانیت کی تقدیر بدلنے میں کیا کچھ رول ادا کرسکتے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، بقول مولانا علی میاں ندویؒ "مدرسہ ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقتور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا اور حرکت ونمو سے لبریز ہے، اس کا ایک سرا نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر ہے، جہاں سے اسلامی آبادی؛ بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے۔" (پاجا سراغِ زندگی:9)

مدرسہ بہت کچھ ہے، تاہم ایسا طاقتور، مستحکم، حرکت ونمود سے لبریز اور تعمیر انسانیت سے بھرپور مدرسہ اینٹ وپتھر یا درو دیوار کا نام نہیں، مدارس کا سارا وجود اور ان کی قوتِ تاثیر ان میں تیار ہونے والے افراد سے وابستہ ہے، انسانی زندگی میں مدارسِ اسلامیہ کے رول کی نزاکت تمام تر اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کیسے افراد کو نسلِ انسانی کے لیے مہیا کر رہے ہیں، مدارس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طلبہ زندگی کے اس موڑ پر کھڑے ہیں جہاں ڈوبتی انسانیت کی نیا کو ساحل لگانے کی تمام تر ذمہ داری انہیں کے کندھوں پر آ پڑتی ہے، وراثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق کی ادائیگی وہ عظیم ذمہ داری ہے، جس کے تصور سے بدن پر رعشہ طاری ہونے لگتا ہے، جس ذمہ داری کو کسی زمانہ میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام انجام دیا کرتے تھے، طالبانِ علوم نبوت دراصل اس کے امین

ومحافظ ہیں، نبوت والی اس عظیم ذمہ داری کے قیام کے لیے کن اونچی ظاہری و باطنی صلاحیتوں اور کمالات کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، ان صلاحیتوں کو مختصر الفاظ میں علم وعمل کے کمال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ایک طرف طالبانِ علوم نبوت کی اس عظیم ذمہ داری اور اس کے لیے مطلوب صلاحیتوں کی ناگزیریت ہے، دوسری طرف طلباءِ مدارس کا رلا دینے والا علمی وعملی انحطاط ہے، اس علم وعمل کے روز افزوں انحطاط کے سلسلہ میں ایسا نہیں کہ ہمارے ذمہ دارانِ مدارس فکر مند نہیں ہیں، انہیں تو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ معیار میں زیادہ سے زیادہ بہتری آئے، لیکن ان کی یہ فکر مندی اور ساری جدوجہد اسی وقت ثمر آور ثابت ہوگی جب طلباء بھی حصولِ علم کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔

نصب العین اور مقصد کی بلندی کا احساس

حصولِ علم میں سب سے زیادہ معاون بننے والی چیز اس علم کے نصب العین اور اس کے بلند مقصد کا احساس وشعور ہے، دنیوی تعلیم میں جس قدر سرگرمی اور دلچسپی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کی بنیادی وجہ مقصد ونصب العین کا شعور ہے، طالبِ علم کو احساس ہوتا ہے کہ محنت کروں گا تو مستقبل میں ڈاکٹر بنوں گا یا انجینئر بنوں گا، مستقبل میں حاصل ہونے والے اس عظیم مقصد کا تصور ہی اس کو جدوجہد میں لگا دیتا ہے، مدارس اسلامیہ کے اکثر طلبہ کی صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی نصب العین نہیں ہوتا، بہت سے طلبہ اس لیے اس میدان کا انتخاب کرتے ہیں کہ ان کے والدین کا اصرار ہوتا ہے، والدین چاہتے ہیں کہ بچہ حافظ بنے، عالم بنے، لیکن خود ان کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا، ایسے طلبہ مدارس میں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں، چوں کہ ان کا اپنا کوئی نصب العین نہیں، اس لیے نہ انہیں پڑھنے سے کوئی رغبت نہ ہی اوقات کی کوئی پابندی، نہ محنت، نہ جدوجہد، ایسے طلباءِ مدارس کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ قرآن وحدیث کے جس علم کے حصول میں وہ لگے ہوئے ہیں، اس کا نصب العین دنیا کے تمام کاموں سے بلند ہے، اس کے بلند اور مہتم بالشان ہونے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ طالبِ علم وراثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حقدار ہوتا ہے، وہ انسانیت کی تقدیر بدل سکتا ہے، اسی سے ہدایت وروحانیت کے چشمہ پھوٹتے ہیں، جس طالبِ علم کے ذہن میں دینی تعلیم کے اس عظیم مقصد کا استحضار ہوگا، وہ اپنی ساری توانائیوں کو علم کے لیے جھونک دے گا۔

اکثر طلباء کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ فارغ ہونے کے بعد مسجد کی امامت یا کسی مدرسہ کی مدرسی سے بڑھ کر ہم کیا کرسکتے ہیں، اس کے لیے ہمیں محنت کی کیا ضرورت ہے، یہی وہ احساسِ کمتری ہے جس نے طلبہ کی تمام قوائے عمل کو مفلوج کرکے رکھ دیا ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خود کامیاب امام

یا کامیاب مدرس کا دارومدار پختہ صلاحیت پر ہے اور امت کو آج کامیاب اور باصلاحیت ائمہ اور مدرسین کی سخت ضرورت ہے، تقریر وخطاب اور نئے پیش آنے والے مسائل میں امت کی صحیح رہنمائی ٹھوس کتابی اور علمی صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں، آج بھی مدارس میں کامیاب اساتذہ کی شدید قلت ہے، پھر اس سے بڑھ کر ایک قابل عالم دین مسجد یا مدرسہ سے ہٹ کر ساری امت کی مختلف میدانوں میں رہنمائی کرسکتا ہے، آج پورے ہندوستان میں ہم ان علماء کی خدمات کو دیکھ رہے ہیں جو اپنے کمال کی وجہ سے پورے ملک کو مستفید کررہے ہیں، احساسِ کمتری کو جب تک ختم نہ کیا جائے طلبہ میں اٹھان نہ پیدا ہوسکے گا۔

جہدِ مسلسل کی ضرورت:

طالب علم کو علم کے بلند نصب العین کا احساس ہو تو پھر دوسرا مرحلہ ذاتی محنت کا ہے، علم ہی کیا کسی بھی کمال کے حصول کے لیے تمام تر بیرونی وسائل کے باوجود ذاتی محنت کی اشد ضرورت ہوتی ہے، دنیا نے جتنے باکمال اشخاص دیکھے ہیں، اس کے پیچھے ان کی ذاتی محنتوں کا بڑا دخل رہا ہے، نصب العین جتنا بلند ہوگا اسی قدر محنت میں زیادتی ہوگی، طلبِ علم کے سلسلہ میں ذاتی محنت پر زور دیتے ہوئے مولانا علی میاں ندویؒ نے نئے تعلیمی سال کے آغاز پر فرمایا تھا: ’’آپ تاریخ کی شخصیتوں میں جس کا بھی نام لیں، جب آپ اس کی سیرت کا مطالعہ کریں گے اس کی زندگی کی تہہ تک جانے کی کوشش کریں گے، تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے والی سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی ذاتی محنت، اس کی فکر ولگن، مقصد کی دھن اور اس کی تڑپ تھی، اس کے بغیر اگر اساتذہ چاہیں یا عظیم الشان ادارے اس کے لیے کوشش کریں، کسی کے بس میں کچھ نہیں، جو بھی بنا ہے اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد سے بنا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اساتذہ کی رہنمائی کی بھی ضرورت ہے، لیکن اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال ہے تو پھر ذاتی محنت سے انسان اپنے آپ کو سب کچھ بنا سکتا ہے‘‘

(پاجا سراغِ زندگی)

بہت ممکن ہے کہ بعض طلبہ ذہنی اعتبار سے کمزور ہوں، لیکن ذاتی محنت انہیں بڑے سے بڑے ذہین طلبہ کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے، امام ابوحنیفہؒ نے اپنے شاگرد امام ابویوسفؒ سے ایک مرتبہ فرمایا: ’’تم بہت کند ذہن تھے، مگر تمہاری کوشش اور مداومت نے تمھیں آگے بڑھا دیا‘‘ اسی طرح امام طحاویؒ کے ماموں امام مزنی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ امام طحاویؒ کو کند ذہن ہونے کی عار دلائی اور کہا: ’’خدا کی قسم تجھ سے کچھ نہ ہوسکے گا‘‘ امام طحاویؒ ابوجعفر احمد بن ابی عمران حنفیؒ کے درس میں شریک ہوگئے اور بڑی محنت سے علم حاصل کیا اور فقہ میں بڑی مہارت حاصل کی، انہیں ماموں نے پھر اس کند ذہن کو امام تسلیم کیا۔ (بستان المحدثین بحوالہ آداب المتعلمین)

حصولِ علم میں محنت کے سلسلہ میں ایک مقولہ علماء میں کافی مشہور ہے کہ: ”العلم لا یعطیک بعضه حتی تعطیه کلک “علم تم کو اپنا ایک حصہ بھی نہیں دے سکتا جب تک کہ تم پورے طور پر اپنے کو اس کے حوالہ نہ کرو، پچھلے زمانہ میں علماءِ سلف انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں جاں توڑ محنت کرتے تھے، مدارس کی جانب سے آج کی طرح قیام وطعام کا تو تصور ہی نہ تھا روشنی تک کے لیے پریشان ہوا کرتے تھے، سدِ رمق خوراک کے لیے حصولِ معاش کا بھی مسئلہ ہوا کرتا تھا؛ لیکن اس کے باوجود وہ حصولِ علم میں کوشاں رہتے تھے۔

اساتذۂ فن سے تعلق

ایک محنتی طالبِ علم کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ بے ڈھب محنت میں لگا رہے، محنت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ماہرِ فن استاذ کی رہنمائی میں ہو، بغیر رہنمائی کی محنت بسا اوقات ایک سنجیدہ طالبِ علم کو بھی علم سے مایوس کردیتی ہے، چوں کہ جب اسے محنت کے باوجود کچھ حاصل ہوتا نظر نہیں آتا تو وہ مایوس ہوکر تعلیم کو چھوڑنے کا فیصلہ کربیٹھتا ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ طلبہ کا اساتذہ سے کتنا گہرا تعلق ہونا چاہیے، علم ایک ایسا جوہر ہے جو استاذ وشاگرد کے مکمل اشتراک ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، طلبہ کو چاہیے کہ وہ متعلقہ فنون کے ماہر اساتذہ سے ربط رکھیں اور فن سے متعلق ان کی رہنمائی میں محنت جاری رکھیں، تاریخ شاہد ہے کہ بہت سے مشاہیر علماء کو علم وفضل کا کمال اپنے بعض اساتذہ کی کامل توجہ سے حاصل ہوسکا، شبلی نعمانیؒ کی عنایت واہتمام نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کو پروان چڑھایا، علامہ انورشاہ کشمیریؒ کی توجہ نے سیکڑوں باکمال شاگردوں کو جنم دیا، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد میں ابویوسفؒ اور محمدؒ جیسے امام وقت پیدا ہوئے، ہمارے دَور میں خود مولانا علی میاں ندویؒ کو جو مقام حاصل ہے، اس سے کون واقف نہیں، مولانا خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں: ”پہلی چیز وہ ذاتی تعلق ہے جو مجھے اپنے اساتذہ سے رہا، وہ تعلق نہیں جو ضابطہ کی خانہ پری کے لیے ہو، بلکہ وہ تعلق جو شب وروز کا تھا، اس تعلق کو میرے مخلص اساتذہ بھی محسوس کرتے تھے اور میں بھی اس کو محسوس کرتا تھا، یہ وہ پہلی چیز ہے جس نے مجھے بہت نفع پہنچایا اور میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ اسی کا صلہ ہے“ (پاجا سراغِ زندگی: 34)

مطالعہ کا اہتمام

مطالعہ طالبِ علمانہ زندگی کا نچوڑ اور اس کا ایک عنصر ہے، اسی سے اس کے علم کی نکھار رہے، اسی سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اوّل تا چہارم کے سالوں میں طلبہ کو اگر درسی اور نصابی کتابوں پر توجہ مرکوز کرنی ضروری ہے، تو اس کے بعد والے سالوں میں خارجی مطالعہ پر زور دینا چاہیے، ابتدائی سال کتابی صلاحیت میں پختگی پیدا کرنے کے ہوتے ہیں، ان میں تو طلبہ کو درسی کتابوں پر ہی توجہ دینی چاہیے، صرف ونحو میں استحکام اور

عبارت خوانی میں کمال پیدا ہونے کے بعد اخیر کے سالوں میں جہاں طلبہ تفسیر وحدیث کے تفصیلی مضامین پڑھتے ہیں، متعلقہ فن کی غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا اہتمام کرنا چاہیے، قاری صدیق احمد باندوی علیہ الرحمۃ نے علماء واسلاف کے مطالعہ کی سرگذشت بڑی تفصیل سے لکھی ہے: حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں ’’میں ایک دفعہ ساری رات امام محمدؒ کے یہاں رہا، آپ کی ساری رات اس طرح گذری کہ کچھ دیر مطالعہ کرتے پھر لیٹ جاتے، پھر اٹھ جاتے اور مطالعہ کرنے لگتے، جب صبح ہوئی تو آپ نے فجر کی نماز پڑھی، جس سے معلوم ہوا کہ ساری رات باوضو رہے اور جاگتے رہے‘‘۔ لکھا ہے کہ امام محمدؒ بہت کم سوتے تھے، اکثر حصہ مطالعہ میں گذارتے، بعض احباب نے کم خوابی اور زحمت کشی کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا: ’’كيف أنام و قدنامت عيون المسلمين تو كلا علينا يقولون إذا وقع لنا أمر رفعناه إليه، فيكشفه لنا، فإذا نمت ففيه تضييع الدين‘‘ ’’سب لوگ تو اطمینان پر سورہے ہیں، کہ جب کوئی مسئلہ پیش آجائے گا تو ہم جا کر اس (امام محمدؒ) سے معلوم کرلیں گے، اب اگر میں بھی سوجاؤں اور دینی کتابوں کا مطالعہ نہ کروں تو اس میں دین کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے‘‘ علماء سلف کے ایسے سیکڑوں واقعات ہیں۔

آج کل مدارس کا حال یہ ہے کہ اوّل تو مطالعہ کا ذوق نہیں، اگر بعض طلبہ میں کچھ رجحان ہے بھی تو ناقص، نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ درسی کتابوں سے ہٹ کر خارجی چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، قرآن وحدیث اور فقہ وسیرت کی بنیادی معلومات بھی ناقص ہوتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ ذوقِ مطالعہ کی کمی ہے، مدارس میں جس طرح تدریسی کتابوں کا نظام ہے، اسی طرح مطالعہ کی کتابوں کا بھی مستقل کورس ہونا چاہیے، مختلف درجوں کے اعتبار سے کتابیں متعین کی جائیں اور اس سلسلہ میں اساتذہ کی پوری سرپرستی حاصل رہے، اکثر طلبہ اپنے زیادہ اوقات درسی کتابوں کے مذاکرہ میں صرف کرتے ہیں اور انہیں شکایت ہوتی ہے کہ خارجی مطالعہ کے لیے وقت نہیں مل پاتا، اس طرح کی بات اوقات کی ترتیب وتنظیم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، طالبِ علم کو مطالعہ اور دیگر علمی کاموں کے لیے اوقات متعین کرلینا ہوگا، درسی کتابوں کے مذاکرہ کا وقت الگ ہو، خارجی کتابوں کے مطالعہ کا الگ ہو، مقالہ نگاری یا مضمون نویسی کا ایک وقت مقرر ہو، تقریر وخطابت کی تیاری کا الگ نظام ہو، اس طرح جب ہر کام کا وقت مقرر ہوگا تو اوقات میں غیر معمولی برکت ہوگی۔ طلباءِ مدارس میں تضییعِ اوقات کی بڑی غلط رسم پائی جاتی ہے، جمعہ اور جمعرات کی تعطیل کے اوقات تو گذر ہی جاتے ہیں، ساتھ ہی تعلیم کے ایام میں بھی بڑی بے دردی سے وقت ضائع کیا جاتا ہے، مطالعہ کی عادت اوقات کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے، ابتداء میں مطالعہ بڑا شاق گذرے گا، لیکن چسکہ لگنے کے بعد اس میں سکون ملنے لگے گا۔

کسی خاص فن میں اختصاص

مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ طلباءِ مدارسِ اسلامیہ سے خطاب کے دوران خصوصیت کے ساتھ دو چیزوں پر توجہ دیا کرتے تھے، اخلاص، اختصاص؛ جہاں تک اخلاص کی بات ہے وہ اگر عام لوگوں کے لیے ضروری ہے تو علماء اور طلباء کے لیے اشد ضروری ہے، اخلاص کا اثر جہاں اعمال پر پڑتا ہے، وہیں طلبہ کی استعداد و صلاحیت اور علمی کمال پر بھی پڑتا ہے، دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کے کمال کے پیچھے اخلاص ہی کار فرما رہا ہے، طلبہ کو دورانِ تعلیم اخلاص کی عملی مشق کی کوشش کرنی چاہیے، اعمال کا محاسبہ کرنا چاہیے، اس کے لیے ابھی سے کسی شیخِ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا چاہیے، اعمال و اخلاص کے سلسلہ میں یہ خیال کہ فراغت کے بعد توجہ دی جائے گی انتہائی غلط ہے، حضرت تھانویؒ اور ان کے خلفاء خصوصیت کے ساتھ طلبہ کو اس معاملہ میں تاکید فرمایا کرتے تھے، دوسری چیز اختصاص ہے، موجودہ دَور اختصاص کا دَور ہے، اس دَور میں وہی شخص اپنی افادیت ثابت کرسکتا ہے جو کسی فن میں اختصاص رکھتا ہو اور اس مقام پر پہنچ چکا ہو جہاں لوگ اس کے محتاج ہو جائیں، ویسے طلبہ کو ہر کتاب میں محنت کرنی چاہیے، تاہم جس فن سے ان کو خصوصی دلچسپی یا مناسبت ہو، دورانِ تعلیم ہی سے اس میں خصوصی محنت شروع کرنی چاہیے، متعلقہ اساتذہ کی نگرانی میں اس فن کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس کا اثر یہ ہوگا کہ فراغت تک فن سے غیر معمولی تعلق پیدا ہوگا اور بعد میں مستقل اس کورس میں حصہ لینا بھی آسان ہوگا۔

نئے تعلیمی سال کے آغاز پر طلبہ یہ اور ان جیسی باتوں کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، تو بہت ممکن ہے کہ پورے سال کی صحیح قدر ہو اور بہت سی خامیوں کی اصلاح ہو جائے، چوں کہ سال کے آغاز پر طلبہ جو کچھ طے کرلیتے ہیں سال بھر اس کا اثر رہتا ہے، آغازِ تعلیم کے موقع پر بعض کتابوں کا مطالعہ بھی بڑا مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

جیسے: (1) پاجا سراغِ زندگی، از مولانا علی میاں ندویؒ،

(2) آداب المتعلمین، از حضرت قاری صدیق احمد باندوی علیہ الرحمۃ،

(3) اخلاق العلماء، از امام ابوبکر آجریؒ،

(4) آپ بیتی، از شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمہ اللہ،

(5) بنیادِ اصلاح، افادات حضرت حکیم الامتؒ وغیرہ۔

اصلاحی مضامین

مدارس کے داخلی نظام کی طرف توجہ کی ضرورت

مولانا غیاث الدین دھامپوری*

عصر حاضر میں مدارس کی ضرورت اور احتیاج اسلامی معاشرہ کے لئے ایسی ہی ہے جیسے انسانی زندگی کے لئے آب وہوا جیسے جیسے سماج میں جہالت، بے دینی، بے راہ روی، اور نت نئے ایمان سوز فتنوں کی افزائش و نشونما ہوتی رہے گی، مدارس ومکاتب کی ضرورت بھی اشد تر ہوتی جائے گی، انسانیت پر مادیت کا شکنجہ جتنا مضبوط ہوتا جائے گا ان روحانی مراکز کے تقاضوں کی شدت اور بڑھ جائے گی، اگر بنظر عمیق معاشرہ کی صورت حال پر نظر ڈالی جائے تو بحسن وخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ اس وقت ان مدارس ومکاتب کی کتنی ضرورت ہے؟ مدارس وہ گہوارۂ علم ہیں، جہاں سے معاشرے کوعلم کی تازگی، جمود کوتحریک، خفتگی کو بیداری ملتی ہے، یہ ادارے اسلامی تشخص کے بقا کا ذریعہ ہے، اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو وقت کے فراعنہ، نماردہ، اکاسرہ، قیاصرہ خدائی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو براہ راست گمراہ کرتے، مدارس اسلامیہ کے مسلم معاشرے پر بے شمار احسانات ہیں؛ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ سامراجی اور صیہونی قوتوں نے مدارس کی اہمیت افادیت اور نافعیت کا بخوبی اندازہ لگالیا اور نام نہاد روشن خیال مسلمان عصری ضرورتوں سے واقفیت کے دعوے دار ابھی تک اس سے ناآشنا ہیں، یہی لوگ اسلام دشمن طاقتوں کے آلۂ کار بن کر مدارسِ اسلامیہ کی روح کو فنا کرنے اور مضبوط اہداف سے پھیرنے کے لئے وقفہ وقفہ سے غیر دانشورانہ اور غیر منصفانہ آراء سے نوازتے رہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تحریک قیامِ مدارس نے دلوں میں گھر کرنے والا پاکیزہ انقلاب برپا کیا، مسلمانوں کو حقیقی اسلام سے روشناس کرایا اور اہل سنت والجماعت کی تشریح (ما انا علیه و اصحابی) کی روشنی میں کی، اس ضمن میں علماءِ دیوبند (جو حقیقت میں اہل سنت والجماعت ہیں) کی خدمات وکاوشیں لائق ستائش وتعریف ہیں، جنہوں نے تحریک قیامِ مدارس سے امت میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔

آج کل عصری تعلیم یافتہ افراد کی جانب سے اہل مدارس کو یہ مشورہ بکثرت دیا جارہا ہے کہ مدارس میں عصری تعلیم وجدید ٹکنالوجی داخل کریں تاکہ طلبۂ مدارس طلبائے کالج و یونیورسٹی سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں، گویا

*صدر مجلس احرار مدرسہ اسلامیہ دھامپور

یہ عصر حاضر میں طلباءِ مدارس کی کامیابی کی کلید ہے، کبھی انھوں نے کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں جاکر منتظمین کو یہ مشورہ دینے کی زحمت گوارانہ فرمائی کہ وہ اپنے طلباء کو جوتے بنانے کا فن بھی سکھایا کریں کیوں کہ ملک کی ترقی کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہے، اور کسی کالج کے پرنسپل کو کبھی یہ مشورہ بھی نہ دیا ہوگا کہ ان طلباء وطالبات کو کپڑے سینے کا م بھی ضرور سکھایا کریں اور کسی انجینیر نگ کالج کے طلباء کو یہ مشورہ بھی کبھی نہ دیا ہوگا کہ وہ دھوبی کا م بھی ضرور سیکھیں یہ بھی بہت ضروری ہے، اگر کوئی شخص ان تجاویز کو عصری تعلیم گاہوں کے منتظمین کے سامنے پیش کرے گا تو وہ ضرور احمق کہلائے گا اس لئے کوئی عقلمند شخص ایسی احمقانہ تجویز کبھی پیش نہ کرے گا؛ مگر دینی مدارس چوں کہ ماہر علماء پیدا کرنے کے لئے مخصوص ہیں، لہٰذا ان کو یہ مشورہ دینا کہ وہ ان طلبہ کو دنیا کا کوئی پیشہ سکھایا کریں اس کی مثال ایسی ہوئی کہ کوئی شخص کیمبریج یونیورسٹی کے منتظمین کو یہ مشورہ دے کہ وہ اپنے طلباء کو بھنگی کا کام ضرور سکھایا کریں۔

آج کل ہر کس وناکس اہل مدارس کو یہی مشورہ دے رہا ہے کہ مدارسِ اسلامیہ زمانے سے ہم آہنگ ہوجائیں اور قدامت پرستی کو ترک کردیں اسی طرح اسلام دشمن طاقتوں نے اہل حق کے مدارس اور اس کے فیضان واثرات کو ختم کرنے اور متوازی اداروں کے قیام کے لئے روشن خیالوں کو اکسایا تو دوسری طرف قدیم و جدید علوم اور تبدیلی نصاب کا شوشہ چھوڑ کر بحث ومباحثہ میں الجھائے رکھا، اسی طرح قدامت پرستی، دہشت گردی اور انتہا پسندی کے الزامات لگا کر عالمی پیمانہ پر مدارس کی کردارکشی کا منصوبہ بنایا، جہاں ایک طرف صیہونی طاقتیں مدارس میں مداخلت کی راہیں تلاش کررہی ہیں وہیں دوسری طرف ہمارے دینی مدارس بھی شدید انحطاط اور زبوں حالی کا شکار ہوچکے ہیں، اگر ہم آج کے دینی مدارس کا مقابلہ ساٹھ ستر سال پہلے کے مدارس سے کریں تو زمین وآسمان کا فرق نظر آتا ہے، اسی انحطاط کی وجہ سے عامتہ المسلمین کی زندگی پر ان مدارس کی تاثیر میں روز بروز کمی آرہی ہے، نیز موجودہ دینی مدارس نے تعمیرات ظاہری، مادی وسائل اور نظم ونسق کے شعبوں میں ضرور ترقی کی ہے؛ لیکن مدارس کی اصلی روح جن پر ان کی حقیقی زندگی موقوف ہے اس میں ہولناک انحطاط واقع ہوا ہے، آج ہماری تمام تر توجہات ظاہر پر مرکوز ہیں ہم چاہتے ہیں کہ کسی طرح مدرسہ کی شہرت میں اضافہ ہو، طلباء کی تعداد بڑھے، عوام میں مدرسہ اور اس کے حل وعقد کی مقبولیت میں اضافہ ہو، لیکن طلباء کی تعلیمی اخلاقی اور دینی حالت کیسی ہو؟ اس پر توجہ برائے نام ہے، بڑی بڑی عمارتوں، وسیع جائیدادوں، اور جدید تقاضوں کے حصول کی فکر نے مقاصد وثمرات کے حصول کی فکر سے بھی غافل کردیا ہے، نیز مالیات کی فراہمی میں احتیاط اور اعتبار کی قید سے بھی آزاد کردیا ہے حد یہ ہے کہ اب ہمارے ذمہ داران مدارس بھی پرائیویٹ اسکولوں کی طرح حکومتوں

کی اسکیموں پر للچائی نظریں ڈال رہے ہیں اور ہر اس ذریعہ سے فائدہ اٹھانے کو ہوشیاری اور کمال سمجھ رہے ہیں جو حکومتوں نے گہری سازش کے تحت مدارس اسلامیہ کے لئے پیش کی ہیں خواہ وہ مقاصد کا خون کر کے ملے، خواہ نتائج سے ہاتھ دھو کر ملے، اس لئے ضروری ہے کہ مدارس دینیہ عربیہ کے ذمہ دار حضرات تحریک قیامِ مدارس کے مقاصد اور طریقہ کار دونوں کو ملاحظہ کریں۔

نیز اس پر بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ ہم دینی مدارس میں درپیش خارجی مسائل سے زیادہ داخلی مسائل پر دھیان دیں کیوں کہ مدارسِ اسلامیہ خیر کے سرچشمے ہیں اور آزاد تعلیمی ادارے ہیں صنعت وتجارت کے مراکز نہیں کہ انہیں اغراض سے چلایا جائے؛ مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں کہ ”ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائص و اعمال کو پہنچائے ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہوگیا ہے، علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اس کو صرف اس لئے ڈھونڈنا چاہئے کہ وہ علم ہے؛ لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتائی ہے وہ علم کا اس لئے شوق دلاتی ہے کہ اس کے بغیر سرکاری نوکری نہیں ملتی بس اب علم کو علم کے لئے نہیں بلکہ معیشت کے لئے حاصل کیا جاتا ہے“

بہرحال! یہ مدارس ہمارے ہاتھوں میں امانت ہے، امانتوں کا لحاظ اور اس کی پاسداری ہم سب کی ذمہ داری ہے اور ہماری خدمات منجانب اللہ عطا کردہ خصوصی مناصب ہیں، دینی مدرسے ہو یا دینی جماعتیں، کھلے دل، کھلے ذہن کے مالک اور اپنے اندر ہر قسم کے طبقے کو سمونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہاں نفرتوں اور انتہاء پسندوں کا دور دور تک گزر نہیں، محبت واحترام اور رواداری کے جذبات چارسو بکھرے ہوئے ہیں۔

ملکِ عزیز میں بھی دو طرح کے ادارے ہیں دینی مدارس وعصری ادارے: مدارس میں انتہائی اعلیٰ درجہ کی للّٰہیت، تربیت اور تہذیب سکھائی جاتی ہے؛ یہاں سے نکلنے والے دیانت دار، بااخلاق اور مہذب ہوتے ہیں لیکن یہ ایک مخصوص دائرے کے عادی ہوتے ہیں، مدرسے میں پڑھا، وہیں پڑھایا، مسجد میں بیان کیا اور خال خال نکاح وموت وغیرہ پر معاشرے سے بھی رابطہ ہوگیا ورنہ عام طور پر ان فضلاء کا معاشرے سے رابطہ کم ہوتا ہے، دوسری طرف بھاری فیس دے کر کسی فن میں مہارت دینے والے عصری ادارے ہیں جن سے لوگ مغربی معاشرے کی کنفیوز (شکوک وشبہات والی) سوچ تو حاصل کر لیتے ہیں؛ لیکن ملکی مفاد اور مقامی ضروریات کے مطابق اخلاق و معاشرتی رویے سیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پہلا قدم ایسے طبقے کا بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم پر اپنی بھاری سرمایہ کاری مع سود وصول کریں، اس کے لئے وہ کرپشن، رشوت، کمیشنز غرض معاشرے میں رائج ہر خرابی میں شریک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں تعلیم سے بہتری کے بجائے برائی میں اضافہ ہونے لگتا ہے،

ایسے وقت ضرورت پیش آتی ہے ایسے نظام تعلیم کی جس کی بنیاد عقل پر ہونے کے بجائے ''وحی'' پر ہو تا کہ اس کے نظریات میں تضاد نہ ہو، ظاہر ہے اس کے لئے مدارس کے نصاب بہت مناسب ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف شعبوں کی اعلیٰ فنی تعلیم کے ذریعہ عصری ترقی کی راہ ہموار ہو اور اس کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم انتہائی ضروری اور مفید ہے۔ گویا دونوں قسم کے اداروں کی مفید باتوں کو ملانے اور کمزور باتوں کو نظر انداز کرنے سے ایک بہترین تعلیمی ادارہ وجود میں آسکتا ہے، علمی ادارے قوم کو بنیادی فکر اور سوچنے سمجھنے کے زاویے عطا کرتے ہیں یہ زاویے درست ہوں تو قوم بلا رکاوٹ ترقی کرتی چلی جاتی ہے اگر غلط ہو تو پستیوں کا شکار ہو جاتی ہے اور اگر واضح نہ ہو تو قوم دگرگوں کیفیت سے دوچار ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کو معلم قرار دیا انہوں نے 'صفہ' اور مسجد نبوی کے تعلیمی اداروں کے ذریعہ قوم کی تربیت کی اور انہیں فکر و سوچ کے منفرد زاویے عطا کئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بدو قوم جس نے کبھی متمدن ماحول میں زندگی نہ گزاری تھی نہ صرف قیصر کسریٰ پر فتح پائی بلکہ ان کی تہذیب کے مقابلے میں اپنی تہذیب و تمدن کو پوری دنیا میں پھیلانے میں کامیاب ہوگئی، اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے مدارس نے اس روایت کو محفوظ کیا ہوا ہے لیکن اس کا ایسا اظہار کہ اس میں سلیقہ اور جاذبیت اتنی ہو کہ عوام الناس کو یہ یقین آئے کہ ان کی امانت محفوظ ہاتھوں میں ہے جو اس کی حفاظت کے ساتھ اس کی اشاعت کے بھی اہل ہیں، یہ آج کے دور میں نہایت ضروری ہے، عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح اور دینی اداروں اور تحریکوں کے شعبۂ ابلاغ و تشہیر پر بھی محنت کرنے کی ضرورت ہے جب تک ہم معاشرے میں اہلیت اور نافعیت ثابت نہیں کرتے تب تک نہ ہم پیغمبرانہ وراثت کی اشاعت کا فرض ادا کرسکتے ہیں اور نہ اپنی گرتی ہوئی ساکھ بچا سکتے ہیں، حسن انتظام، سلیقہ کار اور آداب و اظہار ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہماری دینی تحریکیں اور ادارے اپنا لیں تو اپنا سکہ منوا سکتے ہیں۔

الحمدللہ ہمارے پاس خلوص اور اہلیت کی کمی نہیں بس بات صرف سلیقۂ اظہار اور نفسیات کے ادراک کی ہے، روایت کی حفاظت کے ساتھ اس میں جدت کا اتنا امتزاج ہونا ضروری ہے جو حدود شرع میں بھی ہو اور عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو۔

اصلاحی مضامین

مال داری اور غریبی

از: مولانا سید عادل حقانی قاسمی*

تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے اور ان کے درمیان مختلف درجات قائم فرمائے ہیں، اور ان کو بہ سہولت اپنا تعارف کرانے کے لئے مختلف قبائل میں تقسیم کیا ہے اور انسانوں کے درمیان مالداری اور غریبی کا فرق رکھا، کسی کو مال و دولت وافر مقدار میں عطا کیا ہے اور کسی کو اس سے دور رکھا ہے، کسی کے لئے عیش و تنعم کے سارے اسباب مہیا ہیں اور کسی کو اس کی بھنک تک نہیں لگی، اس تفاوت کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ ثروت لوگ معاشرے میں ہمدردی و غم خواری، ایثار و قربانی کے مظاہرے کریں، ان میں غرباء و مساکین کی خبر گیری اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کا جذبہ زندہ رہے، کمزوروں، لاچار و خستہ حال افراد کو بے حیثیت سمجھنے سے باز رہیں، کیوں کہ احادیثِ مبارکہ میں ان کے متعلق بڑی بڑی بشارتیں اور وعدے بیان کئے گئے ہیں۔

چناں چہ ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ بہت سے پراگندہ بال والے، گرد و غبار سے آلودہ افراد ایسے ہیں جو دروازوں پر دھکے دیئے جاتے ہیں اور جن کو لوگ بے حیثیت سمجھتے ہیں اللہ کے نزدیک ایسے لوگوں کا مقام اتنا اونچا اور بلند ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی معاملہ میں اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ پاک ان کی قسموں کو ضرور پورا کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ بہت سے غریب اور خستہ حال ایسے بھی ہوتے ہیں کہ معاشرہ میں ان کو کوئی مقام اور حیثیت نہیں دی جاتی اور مجلسوں میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی، مال دار طبقہ ان کے ہم راہ چلنے میں عیب محسوس کرتا ہے اور اپنی لڑکیوں کو ان سے بیاہنے میں اپنی تذلیل سمجھتا ہے، اہلِ منصب کے یہاں ان کی بات قبول نہیں کی جاتی، لیکن ایسے بندے اللہ کے نزدیک بڑے ہی قابلِ مبارکباد ہوتے ہیں اور زمین پر ان کا وجود خیر و بھلائی کا مظہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پاک محبت کرتے ہیں ایسے نیکوکار، متقی و پرہیزگار بندوں سے جو اپنے آپ کو چھپائے رکھتے ہیں اور لوگوں کے درمیان خستہ حالی کی وجہ سے غیر معروف ہوتے ہیں، کسی مجلس یا تقریب میں شرکت نہ کریں تو ان کو تلاش تک نہیں کیا جاتا، یا وہ کسی پروگرام یا کسی مجلس

*استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

میں شریک ہوں تو کوئی ان کو اپنے پاس بلانے اور قریب کرنے کی زحمت تک گوارا نہیں کرتا، لیکن ان کے دل ہدایت کے روشن چراغ ہوتے ہیں اور اللہ کے نور سے منور ہوتے ہیں، اور سخت ترین فتنوں میں بھی وہ اپنے ایمان کو محفوظ رکھتے ہیں۔

ایک موقعہ پر جب حضرت سعدؓ اپنے کو دوسروں کے مقابلہ میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے برتر خیال کر رہے تھے اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملی تو آپ نے ان کے اس خیال اور قلبی کیفیت کی اصلاح فرمائی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم لوگوں کی جو مدد ہوتی ہے اور تم کو جو نعمت ملتی ہے وہ تمہاری اپنی ذاتی قابلیتوں کی بنا پر نہیں بلکہ تم میں جو بے چارے کمزور اور خستہ حال ہوتے ہیں ان کی برکت اور ان کی دعاؤں کے بہ دولت ملتی ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ظاہری اسباب مال ومتاع حسب ونسب اور خوش عیش زندگی کو پاکر اپنے کو دوسروں سے اچھا سمجھ بیٹھتا ہے جب کہ یہ بات بالکل مناسب نہیں ہے اس خیال ونظریہ کی اصلاح کے خاطر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت ہی مؤثر نصیحت فرمائی کہ جب تم میں سے کوئی ایسے آدمی کو دیکھے جو مال ودولت جسمانی بناوٹ یعنی شکل وصورت اور خوب صورتی میں اپنے سے بڑھا ہوا ہو تو اُسے چاہیئے کہ کسی ایسے بندے کو بھی دیکھے جو ان چیزوں میں اس سے بھی کمتر ہو تاکہ حرص وطمع سے بچ کر اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کر سکے۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ کو نصیحت کرتے ہوئے سات باتیں بیان فرمائیں، ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ مساکین کے ساتھ محبت کرنا اور ان کی صحبت اختیار کرنا اور دوسری بات یہ ہے کہ دنیوی معاملات میں ان لوگوں پر نظر رکھنا ہے جو اپنے سے کم درجہ پر ہو تاکہ صبر وشکر کی نعمت حاصل ہو سکے اور حرص وطمع جیسی قبیح و مذموم خصلتوں سے بچ سکے اور دینی معاملات میں اپنے سے بلند وبرتر لوگوں پر نظر رکھنا تاکہ دین پر عمل کرنے میں شوق ورغبت پیدا ہو سکے۔

لیکن شامتِ اعمال سے آج ہمارے مسلم معاشرہ میں غریب وخستہ حال افراد کے ساتھ نامناسب وناروا سلوک کیا جارہا ہے بلکہ ولادت، نکاح، ولیمہ جیسے خوش کن و پرمسرت تقاریب میں دعوت دینے سے اعراض کیا جارہا ہے اور گھر پر ان کی آمد کو اپنے وقار کے خلاف محسوس کیا جارہا ہے، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بڑی عظمت ومقامِ بلند احادیث میں بیان فرمایا ہے؛ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی نوجوان نسل کو حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے آراستہ کریں اور ان کو انسانیت نواز کردار سے مزین کرنے کی کوشش اور فکر کریں، اللہ کرے کہ ہم ان ہدایات پر عمل کر کے معاشرہ کے خستہ حال افراد کو بھی عزت کا مقام دیں۔ آمین

گوشۂ اطفال

بچوں میں موبائل فون کے استعمال کے مضر اثرات

ایک سائنسی وسماجی مطالعہ

از: حکیم نازش احتشام اعظمی

معصوم بچے موبائل فون اور ٹیبلٹ استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں، جنہوں نے بولنا بھی شروع نہیں کیا ہوتا۔لیکن ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ بچوں میں موبائل فون کے استعمال کی صحیح عمر کا تعین کرنا خود ان کے لیے بہت ضروری ہے۔ بچوں کی نفسیات کے ایک ماہر کا اس بارے میں کہنا ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں موبائل اور ٹیبلٹ کا استعمال بچوں کی نشو ونما پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے اور وہ بہت سی ایسی جسمانی اور ذہنی سرگرمیوں میں ٹھیک سے حصہ نہیں لے پاتے جو زندگی کے اس موقعے پر اُن کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ان میں تعلیم وتدریس سے لے کر کھیل کود تک متعدد سرگرمیاں شامل ہیں، جنہیں بچوں کی صحت اور سیکھنے کی صلاحیت بہتر بنانے کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ایک ماہرِ نفسیات خاتون سائنسداں کہتی ہیں کہ میرے نزدیک بچوں کے لیے موبائل فون اور ٹیبلٹ کا استعمال شروع کرنے کی صحیح عمر 14 سال ہے،لیکن اس کا انحصار بچوں کے طرزِ عمل اور مختلف چیزوں میں دلچسپی سے ہے۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جب بچے نو بلوغت میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں اور فطری طور پر اپنے لیے زیادہ آزادی کا تقاضا کرتے ہیں۔اس بات کا اظہار وہ اپنے رویے اور عادات میں تبدیلیوں کے ذریعے کرتے ہیں۔لہذا بچوں کے ہاتھوں میں موبائل دینے سے قبل والدین کو لازمی احتیاط کے سلسلے میں معلومات ضرور حاصل کرنی چاہئے۔قابل ذکر ہے کہ موبائل فون کا مسلسل استعمال یوں تو ہر عمر کے افراد کے لیے خطرے کا باعث ہوتا ہے۔مگر بچوں پر اس کے انتہائی مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اب جنوبی کورین ماہرین نے بچوں میں مسلسل موبائل فون استعمال کرنے کا ایک ایسا نقصان بتا دیا ہے کہ آپ یقیناً اپنے بچوں کو فون سے دور رکھیں گے۔ برطانوی اخبار ڈیلی میل کی رپورٹ کے مطابق ماہرین کا کہنا ہے کہ ’’جو بچے بہت زیادہ موبائل فون استعمال کرتے ہیں، یا فون کو اپنی آنکھوں کے بہت قریب رکھتے ہیں، ان کی آنکھوں میں بھینگا پن آنے

کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ کے کونم نیشنل یونیورسٹی ہسپتال (Chonnam National University Hospital) کے ماہرین نے 7 سے 16 سال کے 12 لڑکوں پر اپنی تحقیق کی۔

ماہرین نے ان لڑکوں کو روزانہ 4 سے 8 گھنٹے تک فون استعمال کرنے اور فون کو اپنی آنکھوں سے 8 سے 12 انچ کے فاصلے تک رکھنے کو کہا۔ دو ماہ بعد ان میں سے 9 لڑکوں میں بھینگے پن کی ابتدائی علامات ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ ماہرین نے اپنی تحقیق سے نتیجہ اخذ کیا کہ مسلسل فون پر نظر رکھنے سے بچوں کی آنکھیں اندر کی طرف مڑنے لگتی ہیں اور بالآخر وہ بھینگے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعد ازاں ان بچوں کی موبائل فون کی عادت ختم کروائی گئی، جس سے ان کی بھینگے پن کی علامات بھی ختم ہوگئیں۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ صارفین کو مسلسل 30 منٹ سے زیادہ موبائل فون کی سکرین پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ موبائل فون کو جہاں ایک نعمت سمجھا جاتا ہے، وہیں اس کے بہت سے نقصانات بھی ہیں اور یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ بچوں اور عام لوگوں میں بھی موبائل کا زیادہ استعمال فائدہ کم جبکہ بے شمار نقصانات سے دوچار کر دیتا ہے۔ ہاں یہ بات بھی درست ہے کہ موبائل وقت کے ساتھ ساتھ ضرورت بنتا جا رہا ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ ہم 14 یا 15 سال کی عمر کے بچوں کو موبائل فون دینا شروع کر دیں۔ آج کل لوگ یہ سوچ کر کہ موبائل فون کی بدولت ان کا ان کے بچے سے رابطہ رہے گا، کم عمری میں ہی موبائل فون ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں جو کہ سائنسی لحاظ سے نقصان کا باعث بنتا ہے۔ ایسے کم عمر بچوں سے یا تو موبائل فون چور چھین لیتے ہیں یا پھر وہ خود ہی کہیں انجانے میں چھوڑ آتے ہیں۔ متعدد ایسی خبریں بھی سننے میں آئی ہیں کہ موبائل چوروں نے موبائل فون چوری کرنے کے چکر میں موبائل نہ ملنے پر قتل ہی کر ڈالا۔ موبائل فون کے تعلق سے مذکورہ بالا تفصیلات پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موبائل فون کم عمری میں بچوں کو دینا بے وقوفی ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم جدید ذرائع ابلاغ کی اس حسین پیش کش یعنی موبائل کے ہمارے نونہالوں پر طبی نقطۂ نظر سے کس قدر سنگین تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک سچا مومن اور مہذب ہندوستانی سماج کا حصہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں اپنے بچوں میں بڑھ رہے اخلاقی زوال پر غور کرنا ضروری ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ اینڈ رائڈ انقلاب کے حالیہ دور میں موبائل فون نے جب ہمارے پڑھے لکھے باشعور اور سنجیدہ طبقہ کو بھی اپنی تہذیب و تمدن کو فراموش کرنے پر مجبور کر دیا ہے تو سوچا جا سکتا ہے کہ بچوں میں موبائل فون کا چلن ان کی اخلاقی تربیت کے لئے کس قدر رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہے۔ موبائل فون کے زیادہ استعمال نے انسان کی شرافت اور تمیز کو ختم کر دیا ہے، آج کل لوگ موبائل فون کی گھنٹیاں اور موسیقی کے استعمال

کو خانہ کعبہ، مسجد نبوی، مساجد، خانقاہوں، دیگر مذاہب کی عقیدت گاہوں، پوجا استھلوں اور پرسکون ماحول میں بھی ترک کرنا گوارا نہیں کر پا رہے ہیں، دنیا میں موبائل فون کے مضر اثرات لوگوں پر اس قدر حاوی ہو گئے ہیں کہ وہ مقدس مقامات پر آتے ہوئے بھی اپنے فون کی گھنٹی تک بند کرنا بھول جاتے ہیں، یہ صرف غفلت اور لاپرواہی ہی نہیں بلکہ مقدس مقامات کے تقدس کی پامالی بھی ہے، مساجد میں لوگ نماز کے اوقات میں باہر آ کر فون سننے لگتے ہیں، اس فون نے ہماری زندگی کو اتنا متاثر کیا ہے کہ جب ہم خدا سے ہم کلام ہوتے ہیں تب وہاں بھی موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے، مساجد میں بڑے بڑے نوٹس بورڈ لگے ہونے کے باوجود لوگ موبائل فون بند نہیں کرتے، ہم جب خدا کے کلام سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں اس وقت بھی موبائل فون کی گھنٹی تباہ کن کردار ادا کر رہی ہوتی ہے۔ اس چھوٹے سے آلے نے ہمارے خیالات، اظہار، معاملات، ذہن، قلب اور سکون سب کو بدل ڈالا ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ موبائل فون اور موبائل کمپنیز نے ہمیں کچھ ایسے تحائف بھی دیے ہیں جن کی وجہ سے نوجوان نسل کسی چیز کا خیال نہیں رکھتی اور اپنے آپ کو دنیا سے کچھ الگ سا محسوس کرتی ہے۔ موبائل فون کمپنیز کے متعارف کردہ میسج پیکج نے جہاں رابطوں کو فروغ دیا ہے وہاں ہماری نئی نسل کو رات بارہ بجے کے بعد ایسے ہی مختلف قسم کے ایزی پیکجز نے تباہی میں مبتلا کر دیا ہے، رات بھر میسجز ہوتے رہتے ہیں اور اس کا سیدھا اثر ہماری نوجوان نسل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی صحت پر بھی پڑ رہا ہے۔

موبائل فون اتنی بری چیز نہیں ہے، موبائل فون کا استعمال اسکو برا یا اچھا بناتا ہے۔ اگر ہم موبائل فون کو صرف رابطہ کا ذریعہ سمجھ کر استعمال کریں تو یہ ہمارے لیے مفید ہوگا۔ اللہ بھلا کرے گراہم بیل کا جس نے ٹیلی فون ایجاد کیا۔ مگر اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ جس ٹیلی فون کو وہ ایجاد کر رہا ہے وہ آنے والے دور میں موبائل کی شکل میں لوگوں کی جیبوں میں ہوا کرے گا۔ موبائل فون کے نقصانات کے علاوہ کچھ فائدے بھی ہیں، موبائل فون سے با آسانی چیٹنگ، وائس میل، ای میل، کیش منتقلی اور ڈیٹا کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

یہ امر بھی محل غور ہے کہ اس موبائل کے کچھ فوائد بھی ہیں، جس نے ہمیں بہت ساری دقتوں سے بچانے میں اپنا کردار خوب نبھایا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دور ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس لیے ٹیکنالوجی کے بغیر ہماری قوم ترقی بھی نہیں کر سکتی۔ ٹیکنا لوجی کا استعمال کیا جائے۔ مگر اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ ٹیکنالوجی کا صحیح طریقہ سے استعمال ہو۔ اگر موبائل فون کو صرف ضرورت کے تحت استعمال کیا جائے تو یہ موبائل فون ہمارے لیے اچھا ثابت ہوگا اور اس سے وقت کا ضیاع بھی نہیں ہوگا۔ تازہ سائنسی خبروں کے مطابق یونیورسٹی آف ایلبنی اور یونیورسٹی پٹسبرگ کے کینسر کے شعبے کے سربراہوں نے امریکی ایوان نمائندگان کی قائمہ کمیٹی کو موبائل فون

کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے اور تجویز دی ہے کہ جس طرح سگریٹ نوشوں کو سگریٹ نوشی کے نقصانات سے خبردار کیا جاتا ہے، اسی طرح موبائل فون کے استعمال کرنے والوں کو بھی اس کے مضر اثرات سے خبردار کیا جانا چاہیے۔ یونیورسٹی آف ایلبنی کے ڈائریکٹر ہیلتھ ڈیوڈ کارپنٹر نے قائمہ کمیٹی کو بتایا کہ موبائل فون کے استعمال پر مزید ریسرچ کی ضرورت ہے۔

یونیورسٹی آف پٹسبرگ کے کینسر انسٹیوٹ کے ڈائریکٹر رونلڈ ہربرمین نے کمیٹی کو بتایا کہ ایسی تمام ریسرچ جو یہ کہتی ہیں کہ موبائل فون کے استعمال کا دماغ میں رسولی پیدا ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ بات درحقیقت بہت پرانی ہوچکی ہے۔ انہوں نے کہا ایسی ریسرچ جو یہ کہتی ہے کہ موبائل کے استعمال اور کینسر میں کوئی تعلق نہیں وہ ہفتے میں ایک بار موبائل کے استعمال کو 'کثرت استعمال' سے تعبیر کرتی ہے، جبکہ موبائل فون کا استعمال انتہائی بڑھ چکا ہے۔ سائنسدانوں نے کہا کہ وہ یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ موبائل فون کا استعمال خطرناک ہے، لیکن وہ یہ بھی ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ موبائل فون کا استعمال بالکل محفوظ ہے۔ ڈیوڈ کارپنٹر اور ڈاکٹر ہربرمین نے کمیٹی کو بتایا کہ موبائل فون استعمال کرنے والے بچوں میں کینسر کا خطرہ کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

سائنسدانوں نے ایک ایسا ماڈل بھی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ موبائل فون سے خارج ہونے والی برقناطیسی شعاعیں بالغوں کے مقابلے میں بچوں کے دماغ میں کتنے دور تک گھس جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ہربرمین نے کہا کہ دنیا میں تین ارب لوگ موبائل فون استعمال کررہے ہیں۔

ڈاکٹر کارپنٹر نے کہا کہ اس وقت تک انسان کو موبائل فون کے مضر اثرات سے متعلق اتنی ہی معلومات ہیں جو تیس سال پہلے سگریٹ نوشی اور پھیپھڑوں کے کیسنر سے تعلق کے بارے میں تھیں۔ کیمٹی کو یورپ اور خصوصاً سکینڈ نیویا ممالک میں موبائل فون کے استعمال پر ہونے والی ریسرچ سے بھی آگاہ کیا گیا۔ موبائل فون کا استعمال سب سے پہلے ناروے اور سویڈن میں شروع ہوا۔ ان ممالک کی تحقیق کے مطابق موبائل فون سے نکلے والی شعاؤں کا انسان کی صحت سے رشتہ ضرور ہے۔ سویڈن میں 2008 میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق موبائل کے کثرت استعمال سے کانوں کے قریب کینسر کے پھوڑے بننے کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح رائل سوسائیٹی آف لندن نے ایک پیپر شائع کیا ہے، جس کے مطابق وہ بچے جو بیس سال کی عمر سے پہلے موبائل فون کا استعمال کرنا شروع کردیتے ہیں ان میں انتیس سال کی عمر میں دماغ کے کیسنر کے امکانات ان لوگوں سے پانچ گنا بڑھ جاتے ہیں، جنہوں نے موبائل کا استعمال بچپن میں نہیں کیا۔

آیئے !اب ہم اختصار کے ساتھ اسمارٹ فونس کی شعاؤں کا سائنسی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ اسمارٹ فون

کی اسکرین سے چمکدار نیلی روشنی خارج ہوتی ہے تاکہ آپ انہیں سورج کی تیز روشنی میں بھی دیکھ سکیں۔مگر رات میں یہ روشنی دماغ کو الجھن میں ڈال دیتی ہے کیونکہ یہ سورج جیسی چمک کی نقل ہوتی ہے۔اس کے نتیجے میں دماغ ایک ہارمون میلاٹونین کو بنانا چھوڑ دیتا ہے جو ہمارے جسم کو سونے کے وقت کے بارے میں آگاہ کرتا ہے، اس طرح اسمارٹ فون کی روشنی نیند کے چکر میں مداخلت کرتی ہے اور سونا مشکل تر ہوجاتا ہے۔اس کے نتیجے میں سنگین طبی مسائل کا سامنا ہوسکتا ہے جن میں چند ایک درج ذیل ہیں۔نیچر نیوروسائنسز، ہارورڈ یونیورسٹی اور دیگر جامعات واداروں کی طبی تحقیقی رپورٹس کے مطابق اسمارٹ فونز سے خارج ہونے والی روشنی نیند کے شیڈول میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے جس سے اگلے دن کی یاداشت پر اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔اسمارٹ فونز کی روشنی کے باعث ایک رات کی نیند خراب ہونے سے اگلے دن طالبعلموں کے لیے اپنے اسباق یادرکھنا مشکل ہوجاتا ہے، جبکہ طویل المیعاد بنیادوں پر نیند پوری نہ ہونے سے اچھی نیند کا حصول لگ بھگ ناممکن ہوجاتا ہے۔اسی طرح کچھ شواہد یہ بھی سامنے آئے ہیں کہ یہ روشنی پردہ چشم کو نقصان پہنچا کر بینائی کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے، جبکہ اس حوالے سے تحقیق کی جارہی ہے کہ یہ روشنی کہیں آنکھوں میں موتیے کا سبب تو نہیں بنتی۔مختلف طبی تحقیقی رپورٹس میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اسمارٹ فونز کی روشنی خارج ہونے سے اگر میلاٹونین کی مقدار متاثر ہو تو نہ صرف ڈپریشن بلکہ موٹاپے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔اسی طرح رات کو اسمارٹ فون کی روشنی اور نیند متاثر ہونے سے مثانے کے کینسر میں مبتلا ہونے کے خطرے کا تعلق سامنے آیا ہے۔موبائل فونز کے استعمال کا سب سے بڑا نقصان جسمانی بیماریوں میں اضافہ ہے۔اس حوالے سے ماہرین طب بھی گاہے بگاہے مختلف مشورے دیتے ہیں اور خطرات سے آگاہ کرتے آرہے ہیں۔اگر ڈاکٹرز کے مشوروں پر عمل کیا جائے تو موبائل فونز کے بے جا استعمال کی وجہ سے ذہنی دباؤ، پریشانی، دل کی بیماریوں، سردرد، نظر کی کمزوری اور دوسری پوشیدہ بیماریاں سر نہ اٹھائیں۔مختلف فری کالز اور فری ایس ایم ایس بنڈلز آفرز سے نوجوان نسل ساری ساری رات کالز اور ایس ایم ایس پر لگی رہتی ہے جس کی وجہ سے نیند پوری نہ ہونے کی صورت میں صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔موبائل کے استعمال سے تعلیم پر گہرا اثر پڑتا ہے،موبائل کمپنیوں کی طرف سے صارفین کے لئے نت نئے اور دلکش لیکچرز کو دیکھ کر تو نہ چاہنے والا بھی موبائل فون کو استعمال کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے اور یہی ان موبائل کمپنیوں کی چال ہوتی ہے تاکہ ان کے نیٹ ورک زیادہ سے زیادہ صارفین استعمال کریں۔مگر ان پیکجز سے ہماری نوجوان نسل پر انتہائی برے اثرات مرتب ہورہے ہیں۔پھر ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کثیر تعداد شعبہ تعلیم سے منسلک ہے۔تعلیم کے لحاظ سے ان کیلئے موبائل کے استعمال سے پرہیز کرنا نہایت ضروری ہے اکثر دیکھنے میں آتا ہے

کہ وہ کالجز جہاں موبائل کے استعمال پر کوئی روک ٹوک نہیں پابندی نہیں۔ وہاں طلباء دوران لیکچر ایس ایم ایس یا گیم سے مستفید ہو رہے ہوتے ہیں۔

موبائل فون سے فحاشی اور عریانی میں غیر معمولی حد تک اضافہ ہوا ہے۔ آج کل مختلف ملٹی نیشنل اور غیر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرف سے نئے نئے سیل فونز کا تعارف کروایا جا رہا ہے، جس میں ایک سے زائد سموں کے ساتھ ساتھ کیمرے۔ ایم پی تھری اور فور، انٹرنیٹ سمیت کتنی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ جن کا موبائل فون سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مگر نوجوان طبقہ اس ضرورت کی چیز کو غیر ضرورت کے طور پر استعمال کر رہا ہے اور اس میں ویڈیوز اور تصاویر بنا کر مطلوبہ افراد کو بلیک میل بھی کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی ہمارے نونہالوں کے تعلق تشویش کا باعث ہے کہ موبائل فون کی فراوانی سے کرائم میں اضافہ ہوا ہے۔ جس میں خاص طور پر اغوا برائے تاوان، راہزنی کی وارداتیں قابلِ ذکر ہیں جب کہ موبائل فون چھیننے کے واقعات اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ جن کی تعداد گننے میں نہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ موبائل کے طفیل بڑھنے والی جرائم کی وارداتوں میں ہمارے معاشرے کے نیم بالغ یا نوبالغ بچے زیادہ ملوث پائے جا رہے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ موبائل چوری یا اس سے متعلق اسکینڈل میں پکڑے جانے والوں میں 17۔18 برس کی عمر کے بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر چہ اس پر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے کافی حد تک کام کرنا شروع کر دیا ہے، مگر کرائم و جرائم اور خودکشیوں کی بڑھتی وارداتوں میں موبائل فون کے غلط استعمال کو روکنے کیلئے اس سے کہیں زیادہ سیکورٹی اداروں اور ٹیلی کمیونیکیشن کے اداروں کو اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔

موبائل فون کے حوالے سے اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں جن کو شمار کرنا ابھی باقی ہے۔ مگر یہ نقصانات ہیں جو ہم معاشرے میں دیکھ اور جھیل رہے ہیں، ان نقصانات سے بچنے کے لئے کچھ ایسی تدابیر اور ایسے کام کرنے کی ضرورت ہے جن کی وجہ سے ہم اپنی ضرورت کی اس چیز کو استعمال تو کریں مگر اس کے معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات سے بھی بچا جا سکے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ذمہ داری والدین کی ہے کہ وہ بچوں کو موبائل لے کر دینے سے پہلے اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ آیا ان کے بچے کو موبائل کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ پھر اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ بچے موبائل کا استعمال کس طرح سے کر رہے ہیں؟ کس سے بات کر رہے ہیں؟ کیا بات کر رہے ہیں؟ بچوں کی غیر موجودگی میں ان کے موبائل کو دیکھیں کہ بچے موبائل فونز کا غلط استعمال تو نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام نوجوان بھی اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ اپنے وقت کو موبائل کی فضول کالوں اور غیر اخلاقی حرکات سے ضائع نہ کریں۔ (یو این این، بہ شکریہ بصیرت فیوچرز)

فقہ اسلامی (قسط۔۲)

اسلامی انشورنس دورِ حاضر کی شدید ترین ضرورت

از: مفتی احسان احمد قاسمی*

مروجہ انشورنس کا نظام:

مروجہ انشورنس کا نظام چونکہ اہل مغرب کی جانب سے دیا گیا ایک تحفہ ہے اور مغربی نظام معیشت کا تصور یہ ہے کہ جب تک انسان میں خودغرضی نہ ہو اس وقت تک معیشت ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ خودغرضی اور ذاتی مفاد ہی ایسا محرک ہے جو انسان کو محبت اور تگ ودو پر ابھارتا ہے اس لئے ان کی جانب سے تشکیل دئے گئے تمام ہی معاشی اداروں کی بنیاد عامۃً سود، قمار اور غرر پر ہے تاکہ سرمایہ کار کو نفع تو حاصل ہو، لیکن اس کو نہ دوسروں کا تعاون کرنا پڑے اور نہ اپنے سرمایہ کے سلسلہ میں کسی قسم کا رسک اور خطرہ پیدا ہو ایسے ہی اداروں میں ایک انشورنس بھی ہے۔

دراصل انشورنس ایک معاملہ ہے جو انشورنس کے طالب اور کمپنی کے درمیان ہوتا ہے اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ انشورنس کمپنی (جس میں بہت سے سرمایہ دار اسی طرح شریک ہوتے ہیں جس طرح تجارتی کمپنیوں میں کئی ایک سرمایہ دار شریک رہتے ہیں) انشورنس کے طالب سے ایک معینہ رقم بالاقساط وصولی کرتی رہتی ہے اور ایک معینہ مدت کے بعد وہ رقم اسے یا اس کے پسماندگان کو (حسب شرائط) واپس کردیتی ہے اس کے ساتھ ایک مقررہ شرح فیصد کے حساب سے اصل رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم بطور سود دیتی ہے کہ اس رقم کا نام ان کی اصطلاح میں سود نہیں بلکہ بونس یعنی منافع ہے۔ (جواہر الفقہ ج ۴)

مجموعی طور پر جن چیزوں کا انشورنس کرادیا گیا ہے خواہ وہ کسی کی ذات ہو، یا کوئی مال ہو، یا ذمہ داریاں ہوں، اگر مدت معینہ میں کسی نقصان سے دوچار ہوجائیں تو کمپنی ان کے نقصان کی تلافی کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ بظاہر اس نظام کے اس قدر نفع بخش ہونے کے باوجود اس کے عدم جواز کی کیا وجہ ہے؟ اور اسلامی انشورنس کا وہ کونسا امتیاز ہے جس کی وجہ سے اس میں جواز کی شکل پیدا ہوگئی ہے؟

*استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ مروجہ انشورنس عقد معاوضہ ہے اور عقد معاوضہ میں قمار اور غرر کا تحقق ہو تو وہ عقد ناجائز ہے۔ اور اسلامی انشورنس (تکافل) عقد تبرع پر مبنی ہے جس میں ان امور کا تحقق نہیں ہوتا۔ اس جواب کی تفصیل کو سمجھنا چند امور کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

مروجہ انشورنس اور اسلامی انشورنس (تکافل) میں حد امتیاز

نظام کے اعتبار سے ان دونوں میں نہایت قربت بلکہ یکسانیت ہونے کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ایک جائز اور ایک ناجائز؟ اس سوال کا جواب ان دونوں کی بنیاد سمجھنے پر موقوف ہے مروجہ انشورنس کی بنیاد عقدِ معاوضہ پر ہے اور (اسلامی انشورنس) تکافل کی بنیاد عقد تبرع پر ہے۔

عقد معاوضہ: Commutative Contract وھی ماکان التملیک فیھا عین المال او منفعتہ بمقابل سواء کان المقابل مالا او نحوہ

ترجمہ: عقود المعاوضات ان عقود کو کہتے ہیں جن میں کسی کو عین مال (Corpus) یا منفعت (usufruct) کا مالک بنایا جاتا ہے کسی عوض کے بدلہ میں خواہ وہ عوض مال ہو یا کوئی اور چیز۔

یعنی عقد معاوضہ میں ایک شخص دوسرے کو مال وغیرہ کے بدلے میں کسی مال یا مال کی منفعت کا مالک بناتا ہے جیسا کہ بیع اور اجارے میں ہوتا ہے۔ ان عقود میں بیع، اجارہ، سلم، نکاح، رہن، خلع، صلح بالمال، ہبہ بشرط العوض وغیرہ داخل ہیں۔

عقد تبرع: تبرع کے معنیٰ لغت میں احسان کرنے کے آتے ہیں، اور اصطلاحاً اس کی تعریف ہے: وھی ماکان التملیک من غیر مقابل مثل الھبۃ، والصدقۃ، والوصیۃ والوقف، والاعارۃ

ترجمہ: عقد تبرع ان عقود کو کہتے ہیں جن میں کسی کو کسی چیز کا مفت مالک بنا دیا جائے جیسے ہبہ، صدقہ، وصیت، وقف عاریت وغیرہ۔

یعنی عقد تبرع میں ایک جانب سے شئی ہوتی ہے جس کا دوسرے کو مالک بنا دیا جاتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں کوئی بدل نہیں ہوتا۔ (تکافل کی شرعی حیثیت)

ربا، غرر، اور قمار کی تعریفات: (ربوٰ: Interest /usury)

ابن العربی نے احکام القرآن میں ربا کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

الرباء فی اللغۃ ھو الزیادۃ، والمراد فی الآیۃ کل زیادۃ لا یقابلھا عوض

ترجمہ: ربا لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں، آیتِ کریمہ میں اس سے مراد ہروہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو۔

ابن العربی کی یہ تعریف ربا الفضل اور ربا النسیۃ دونوں کو شامل ہے کیونکہ ایسا اضافہ جو کسی عوض کے مقابلہ میں ہو یہ ربا النسیۂ میں بھی پایا جاتا ہے، اس میں اپنا قرض پورا پورا لیا جاتا ہے، اور اس پر سود کے نام سے جو اضافہ ملتا ہے وہ بلا معاوضہ ہوتا ہے اور یہ صورت ربا الفضل میں بھی پائی جاتی ہے کیوں کہ اس میں دو چیزوں کا تبادلہ ہوتا ہے اور کسی ایک جانب میں ایسی زیادتی پائی جاتی ہے جو کسی عوض کے بدلہ میں نہیں ہوتی لہذا ابن عربی کی تعریف اپنی جامعیت کی بنا پر عمدہ تعریفات میں شمار کی گئ ہے۔

قمار،میسر (Gambling)

علامہ خطابیؒ قمار کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ نقل فرماتے ہیں: انما ھو مواضعة بین اثنین علی مال یدور بینھما فی الشقین فیکون کل واحد منھما الا نما او غارما

ترجمہ: قمار دو آدمیوں کے درمیان کسی ایسے مال پر معاہدہ ہے جو ان دونوں کے درمیان دائر ہو، ان میں سے ہر ایک جیت بھی سکتا اور ہار بھی سکتا ہے۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے جواہر الفقہ میں تحریر فرمایا کہ ''قمار ہر وہ معاملہ ہے جو نفع ونقصان کے درمیان دائر اور مبہم ہو، قمار کو عرف میں جوّے سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے کرکٹ ٹیم نے آپس میں طئے کیا کہ اگر تمہاری ٹیم جیتے گی تو ہم تم کو ایک ہزار روپیہ دیں گے اور اگر ہماری ٹیم جیتے گی تو تم ہم کو ایک ہزار دینا، یعنی قمار کی حقیقت یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد آپس میں اس طرح کا کوئی معاملہ طئے کریں جس کے نتیجے میں کسی غیر یقینی واقعہ کی بنیاد پر اپنا کوئی مال اس طرح داؤ پر لگا دے کہ وہ یا تو بلا معاوضہ دوسرے فریق کے پاس چلا جائے یا دوسرے فریق کا مال پہلے فریق کے پاس بلا معاوضہ چلا آئے اسی کو مخاطرہ بھی کہا جاتا ہے جس میں یا تو اصل رقم بھی ڈوب جاتی ہے یا مزید رقم کھینچ کر چلی آتی ہے اور یہی قمار اور جوا بھی ہے۔

غرر:

غرر کے لغوی معنیٰ دھوکہ دہی (cheat deceive) غلط امید دلانا true entice اور خطرہ (Hazard Risk Danger) کے ہیں۔

اصطلاحاً غرر کی مختلف تعریفات کی گئی ہیں، صاحبِ بدائع نے غرر کی یہ تعریف کی ہے:

الغرر ھو الخطر الذی استویٰ فیہ طرف الوجود والعدم بمنزلۃ الشک (بدائع فصل فی شرائط صحۃ البیوع)

یعنی غرر اس خطر کو کہتے ہیں جس میں شک کی طرح وجود اور عدم برابر ہو۔

ربا، قمار اور غرر کی تعریفات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ صورتیں عقودِ معاوضہ میں اثر انداز ہوں گی نہ کہ عقود تبرع میں۔

جیسے اگر آپ نے کسی کو بطور ہدیہ دس ہزار روپئے پیش کئے انہوں نے اس کو قبول کر لیا پھر انہوں نے اس ارادے کے ساتھ کہ احسان کا بدلہ احسان ہے کسی موقع سے آپ کو بارہ ہزار روپیہ بطور ہدیہ پیش کیا تو اس میں دو ہزار کی زائد رقم سود نہیں کہلائے گی کیوں کہ عقدِ تبرع میں زیادتی ربا نہیں ہے۔ ربا کا تحقق صرف عقدِ معاوضہ میں ہی ہوگا چناں چہ اگر یہی صورت قرض کے لین دین میں پائی گئی جب کہ قرض دینے والا اس زیادتی کی شرط رکھتا ہو تو جائز نہیں ہے، یہ سود ہے کیوں کہ یہ عقدِ معاوضہ ہے۔

نیز کسی کا دس طلبہ کے درمیان یہ کہہ کر مقابلہ کروانا کہ جو پہلے نمبر سے کامیاب ہوگا اس کو ادارہ انعام دے گا یہ ادارے کی جانب سے تبرع ہے قمار نہیں، لیکن انہی طلبہ سے رقم یہ کہہ کر وصول کرنا کہ جو پہلے نمبر سے کامیاب ہوگا پوری رقم اس ایک کو دیدی جائے گی، یہ قمار میں داخل ہے کیوں کہ یہ عقد معاوضہ ہے۔

مذکورہ تفصیل کے بعد یہ بات سمجھنا آسان ہے کہ مروجہ انشورنس کا نظام عقد معاوضہ پر مبنی ہے کیوں کہ وہاں کمپنی اپنے کسٹمر سے اس بات کا معاہدہ کرتی ہے کہ جہاں حادثہ پیش آنے کی صورت میں کسی نقصان کی پابجائی کرے گی وہیں حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں اس رقم کو دوگنا سہ گنا کر کے واپس کرے گی، جس کی وجہ سے اس میں ربا، قمار اور غرر کی کئی صورتیں داخل ہو چکی ہیں، اس کے برخلاف اسلامی انشورنس جس کو تکافل بھی کہا جاتا ہے اس کی بنیاد عقدِ تبرع پر ہے جس کی وجہ سے یہ نظام ان مفاسد سے پاک ہے کیوں کہ مروجہ انشورنس کی کسی بھی پالیسی کو خریدنے والا دی گئی رقم کے ساتھ مزید رقم حاصل کرنے کے ارادے سے دیتا ہے بلکہ یہ تو باضابطہ تجارتی کمپنیاں ہیں جو انشورنس کو تجارت بنائی ہوئی ہیں۔

اس کے برخلاف تکافل کمپنی تجارتی نہیں بلکہ باہمی تعاون پر قائم ہوتی ہے جس میں رقم دینے والا شخص بطور ھبہ ناقابلِ واپس رقم دیتا ہے، البتہ اگر وہ بھی کسی حادثے سے دوچار ہو جائے تو وہ بھی اس رقم سے فائدہ اٹھاتا ہے جو شرعاً جائز ہے۔

یہ تکافل کا محض تعارف ہوا، اس کا طریقۂ کار اگلی قسط میں آئے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

فقہ وفتاویٰ

زکوٰۃ کے چند شرعی مسائل

ادارہ

سونے چاندی کا نصاب گرام کے اعتبار سے

مسئلہ: سونے کا نصاب عربی اوزان کے اعتبار سے ۲۰/مثقال ہے، جس کا وزن تولہ کے حساب سے ساڑھے سات تولہ اور گرام کے اعتبار سے ۸۷/گرام ۴۸۰/ملی گرام ہوتا ہے،

چاندی کا نصاب عربی اوزان کے اعتبار سے دوسو درھم ہے، جس کا وزن تولہ کے حساب سے ساڑھے باون تولہ اور گراموں کے اعتبار سے ۶۱۲/گرام ۳۶۰/ملی گرام ہوتا ہے۔ (تاتارخانیہ، زکریا: ۱۵۵/۳)

حج کے لئے رکھے ہوئے روپیوں پر زکوٰۃ

مسئلہ: اگر کسی صاحبِ نصاب شخص نے حج کی نیت سے روپئے جمع کر رکھے تھے اسی دوران سالانہ زکوٰۃ نکالنے کا وقت آ گیا تو اس پر حج کے لئے رکھی ہوئی پوری رقم کی زکوٰۃ نکالنا بھی لازم ہوگا۔ (شامی زکریا: ۱۷۹/۳)

حج کمیٹی میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ کی تفصیل

مسئلہ: اگر کسی شخص نے حج کے ارادہ سے حج کمیٹی میں مکمل روپیہ جمع کرادیا تھا اسی دوران اس کی زکوٰۃ کے حساب کا وقت آ گیا تو جمع شدہ رقم میں سے ہوائی جہاز کا کرایہ، معلم فیس، اور دیگر اخراجات نکال کر سعودی ریال کی شکل میں اس عازم حج کو جو رقم واپس ملنے والی ہے اس پر زکوٰۃ نکالنی ضروری ہوگی۔

(مستفاد از مسائل بہشتی زیور ۳۲۲، از: مولانا مفتی عبدالواحد صاحب لاہور)

تجارتی پلاٹوں اور فلیٹوں پر زکوٰۃ

مسئلہ: جو پلاٹ یا زمین فروخت کی نیت سے خریدے گئے ہیں تو ان کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (تاتارخانیہ زکریا: ۱۶۴/۳)

فکس ڈپازٹ رقم پر زکوٰۃ

مسئلہ: بعض لوگ اپنی رقومات بنکوں میں کئی سالوں کے لئے فکس ڈپازٹ کرادیتے ہیں، تو چوں کہ یہ دین قوی کے درجہ میں ہے جس کا بعد میں مقررہ وقت پر ملنا یقینی ہے؛ اس لئے اس اصل جمع شدہ رقم پر ہر سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی؛ لیکن جو رقم بڑھ کی ملے وہ قطعاً حرام ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں (بلکہ اضافی رقم کو سودی مصارف میں ہی خرچ کرنا لازم ہے)۔ (درمختار زکریا: ۳/۲۳۶)

شادی کے لئے رکھے گئے زیورات پر زکوٰۃ

مسئلہ: اگر ماں باپ نے بچی یا بچے کی شادی کے لئے زیورات بنا کر رکھے ہیں اور وہ ابھی بچوں کو حوالے نہیں کئے گئے؛ بلکہ اپنی ہی ملکیت میں ہیں تو ان کی مالیت پر حسبِ ضابطہ زکوٰۃ ماں یا باپ پر واجب رہے گی اور اگر بچوں کی ملکیت میں دے دیئے ہیں تو جب تک وہ نابالغ ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور بالغ ہونے کے بعد اگر نصاب وغیرہ کی شرائط پوری ہوتی ہوں تو سال گذرنے پر ان پر زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔
(محمود الفتاویٰ: ۲/۸۵)

مکان بنانے کے لئے جمع کردہ رقم پر زکوٰۃ

مسئلہ: کسی شخص نے مکان بنانے کے لئے رقم جمع کر رکھی تھی، اس درمیان زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت آ گیا تو اس پر مذکورہ جمع شدہ رقم کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی لازم ہے۔ (شامی زکریا: ۳/۱۷۹)

کس طرح کے اموال میں زکوٰۃ واجب نہیں؟

مسئلہ: آگے لکھے جانے والے اموال اور اثاثہ جات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، خواہ ان کی قیمت کتنی ہی ہو: (۱) رہنے کے گھر، (۲) کرائے پر اُٹھائے گئے مکانات (البتہ ان کی آمدنی پر زکوٰۃ حسب ضابطہ واجب ہوگی) (۳) استعمالی کپڑے، چادریں، فرش وغیرہ، (۴) گھر کا ساز وسامان (فریج، کولر، واشنگ مشین وغیرہ) (۵) سواریاں (گاڑی موٹر سائیکل وغیرہ)، (۶) غلام باندیاں جو خدمت پر مامور ہوں۔ (۷) اپنی حفاظت کے لئے رکھے گئے ہتھیار۔ (۸) گھر میں رکھا ہوا کھانے پینے کا ذخیرہ (۹) سجاوٹ کے برتن، (۱۰) ہیرے جواہرات (جبکہ تجارت کے لئے نہ ہو)۔ (۱۱) مطالعہ کی کتابیں۔ (۱۲) صنعت کاروں کے اوزار، اور مشین، کارخانے، فیکٹریاں، کرایہ پر چلنے والی بسیں اور ٹرک اور کاشت کار حضرات کے ٹریکٹر اور آلاتِ زراعت وغیرہ۔ (نیز ہر ایسا سامان جو تجارت کی نیت سے نہ خریدا گیا ہو)۔ (تاتارخانیہ زکریا: ۳/۱۷۳)
(ماخوذ از: کتاب المسائل: ۲/۱۳۴ تا ۱۴۶)

خبرنامہ

عالمِ اسلام کی خبریں

✷ روہنگیا بحران، میانمار حکومت کو انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنے کا اعلان۔ (او ای سی)

(روزنامہ اعتماد ۸ رمئی ۱۸ء)

✷ شام کو اسرائیل کے خلاف اپنے دفاع کا پورا حق، ایران۔ (روزنامہ اعتماد، ۱۲ رمئی ۱۸ء)

✷ فلسطینیوں کی نسل کشی، ترکی نے اسرائیل اور امریکہ سے سفیر واپس بلالئے۔

(روزنامہ اعتماد، ۱۶ رمئی ۱۸ء)

✷ غزہ قتل عام کے خلاف مظاہرے جاری، انصاف کا مطالبہ، امریکی شہر نیو یارک، اسٹریلیا کے شہر ملبورن میں ریالیاں نکالی گئیں، قتل عام پر آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا۔ (روزنامہ انقلاب، ۲۱ رمئی ۱۸ء)

✷ خواتین کی ڈرائیونگ پر عائد امتناع کو برخواست کرنے کا مطالبہ کرنے والے جہدکاروں کو سعودی عربیہ نے حراست میں لیا۔ (روزنامہ سیاست، ۲۱ رمئی ۱۸ء)

✷ رمضان میں شاہ سلمان امدادی سینٹر سے روہنگیا مسلمانوں کے لئے امداد۔ (روزنامہ انقلاب ۲۱ رمئی ۱۸ء)

✷ عرب ممالک کے امتناع کے بعد قطر میں دودھ کا نیا پلانٹ قائم۔ صحرا میں گائیوں کو فروغ دینے کا کام تیزی سے جاری۔ (روزنامہ سیاست، ۲۴ رمئی ۱۸ء)

✷ اسرائیل کا مغربی کنارہ میں مزید ۲۵۰۰ مکانات تعمیر کرنے کا منصوبہ۔ (روزنامہ سیاست: ۲۵ رمئی ۱۸ء)

✷ قطر نے سعودی عرب' متحدہ عرب امارات' بحرین اور مصر کی اشیاء پر پابندی لگادی

(روزنامہ منصف، ۲۷ رمئی ۱۸ء)

✷ زم زم کے چشمے سے یومیہ ۱۶ لاکھ ۴۰ ہزار لیٹر پانی نکلتا ہے (روزنامہ منصف، ۲۸ رمئی ۱۸ء)

✷ مہاجر شامیوں کی املاک ضبط کرنے بشار الاسد کا منصوبہ؛ یورپی یونین اور ایمنسٹی کا اظہارِ تشویش (روزنامہ اعتماد، ۲۸ رمئی ۱۸ء)